بلکتے قہقہے

منذیر جہانگیر / ابوالخیر

بلکتے قہقہے

نذیر جہانگیر / ابوالخیر

سن اشاعت : 2007ء

:

کمپوزنگ : مبشر احمد (بلال کالونی، صورہ،)

Mob: 9419404196

ایڈریس : پوسٹ بکس نمبر 1390

جی پی اُو سرینگر 190001

تعداد : 1000

''اس کتاب کی طباعت کے لئے جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سے مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ظاہر کی گئی آراء سے کلچرل اکیڈمی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ اس ضمن میں کلچرل اکیڈمی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔''

"I am thankful to the J&K Academy of Art, Culture & Languages for providing financial assistance for publishing of my manuscript titled "Bilaktay Kehkahay" in urdu language. The Acadamy should not be resposible in any way for any sort of controversy, omissions or commissions in the contents of this book".

(اگر کوئی اس کتاب کے متعلق اپنی رائے دینا چاہے تو اس نمبر پر Message (پیغام) دے سکتا ہے:
9906646898 - یہ نمبر صرف Messages کے لئے ہی مخصوص ہے۔

فہرست مضامین

نمبر عنوان صفحہ نمبر

چند باتیں قارئین سے
خلوص و محبت کے ساتھ

☆

یوں تو ہمارے یہاں ادیب ہونا کوئی حیرت کی بات تو نہیں ہے مگر یہاں کے ادیب کی کتاب کا فروخت ہونا تعجب خیز ضرور ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے میں اپنی اس گیارہویں تصنیف کو آپ کے سامنے پیش کرتے ہوئے ویسے کسی جرم کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہوں تاہم آپ کی خریداری سے یہ شبہہ مل سکتی ہے کہ کشمیری ادبا کی کتابوں کی خریداری ابھی ممنوعات میں شامل نہیں ہے۔

بیس بائیس برس قبل ''وغیرہ وغیرہ'' کے عنوان سے ایک مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا تھا اور پھر یہ 'روایت' کچھ ایسی مقبول عام ہوئی کہ کئی اور اخبارات کے لئے بھی دوسرے عنوانات کے تحت میرا یہ شغل جاری رہا۔ ان میں ''اپنا خیال رکھئے گا۔!'' کا کالم قارئین میں میری کم ظرفی کے باوجود کچھ زیادہ ہی دلچسپی کا باعث بنا۔

میں خود سیدھا سادھا آدمی ہوں اور یہی تاثیر میرے مضامین میں بھی آ گئی ہے۔ سیدھے سادھے لفظوں میں اُن حالات، واقعات اور تجربات کو قارئین تک رسائی دینے کی کوشش کی ہے جن سے مین گزرتا رہا یا جو مجھے اپنے سے ''گزارتے'' رہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر میرے اِن مضامین کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا تو قاری کا تخیل بھی ماضی کے دھندلکوں میں پرواز کر سکتا ہے (بشرطیکہ قاری نابالغ نہ ہو)۔

اِس بات کے لئے بھی میں نے اپنے اندر یقین کی گنجائش پیدا کر لی ہے کہ

وہ لوگ جو لطیفے سُن کر میکانکی عمل کی طرح اپنے ہونٹ پھیلانے کے عادی ہیں، اُن میں بھی شاید میرے یہ ''رائیٹ اپ'' واقعی مسکراہٹوں کا جذبہ بیدار کرنے کا سبب بنیں گے۔

جیسا کہ پہلے ہی عرض کر چکا کہ یہ کتاب میری گیارہویں تصنیف ہے، میں اس کتاب سے پہلے کی تصانیف میں بھی یہ بات دہرا چکا ہوں کہ مزاح لکھنا ایک مشکل کام ہے اور میرا کوئی ایسا دعوٰی بھی نہیں ہے کہ میں اپنے مضامین میں لفظوں کے موتی قبائے قرطاس پر ٹانک دیتا ہوں اور نہ ہی یہ وسوسہ ہے کہ میں بلند پایہ کا کوئی ادیب ہوں۔ کسی لگی لپٹی کے بغیر اِس بات کا اعتراف ہے کہ مجھ جیسے بے علم و بے مایہ اور ناکارہ و آوارہ نے اپنے کچھ تجربات اور رُوداد یا حادثات ضبطِ تحریر میں لائے ہیں اور پھر ان کو کتابی شکل دینے کی چاہت میں 'احمد کی ٹوپی محمود کے سر پر' رکھ کر پیسوں کا انتظام کیا ہے اور اس امید کے ساتھ یہ کتاب شائع کی کہ شاید کوئی 'سر پھرا' یا 'دل جلا' دو چار فقرے ہی چُست کر لے!

حق تو یہ ہے کہ علم اصل میں خدا کی معرفت ہے اور باقی جو ہے وہ معلومات کے زمرے میں آتا ہے۔ اور اگر کسی چھوٹے کو اپنے بڑوں سے معلومات زیادہ ہوں تو ممکن ہے مگر اس سے چھوٹوں کو بڑوں پر فضیلت نہیں ہو سکتی۔

حضرت سلیمانؑ نے جب پرندوں کی حاضری لی تو ہدہد کو نہ دیکھا۔ فرمانے لگے کہ یہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا، کیا کہیں غائیب ہو گیا؟ میں اس کو غیر حاضری پر سخت سزا دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی اور عذر غیر حاضری کا

میرے سامنے پیش کرے۔ سو تھوڑی ہی دیر میں وہ آ گیا اور سلیمانؑ سے کہنے لگا کہ جی ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوگی اور پھر ہدہد نے قبیلہ سبا کی خبر بتائی۔

تو بزرگ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ کسی واقعہ حسیہ کا علم اگر ناقص کو ہو اور کامل کو نہ ہو تو ممکن ہے اور حسیات میں کسی کے علم کا زیادہ ہونا کوئی کمال نہیں۔
ایک جانور ہُد ہُد کا علم نبی سے جذئی خاص میں ہبڑھا ہوا تھا سو اس علم سے سلیمان پر ہُد ہُد کو فضیلت نہیں ہو سکتی۔

بعض دفعہ بڑی بڑی تحریروں میں پُر شوکت الفاظ اور بحر ذخار کی طرح روانی بھی ہوتی ہے مگر جسم ہے روح ندارد!۔ اور بعض دفعہ سیدھے سادھے الفاظ میں بھی درد اور محرومی کا تڑپتا ہوا طوفان موجزن نظر آتا ہے۔ اپنی اس کتاب کے تعلق سے یہ بات اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے مضامین کو دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کی کوشش ہو تو ان مین دلِ آویزی کے ساتھ معنویت کی گہرائی بھی دریافت ہو سکتی ہے (شاید کسی دل جلے کی مسکراہٹوں کا سبب بھی بن جائے)۔

ظرافت کے تعلق سے پہلے ہی تھوڑی بہت تفصیل اپنی ایک تصنیف 'بہتے جسم' میں بیان کی ہے، یہاں اُنہی جملوں کو دُہرا رہا ہوں۔

ظرافت کے تین درجے ہیں ایک کو 'طنز' کہتے ہیں، دوسرا 'مزاح' ہے، اور تیسرا 'ہجو' میں شمار ہوتا ہے۔

'ہجو' کے پیچھے عناد اور جذبہ انتقام ہوتا ہے۔ 'طنز' میں جارحیت اور اذیت کوشی

کا عنصر ملتا ہے جب کہ 'مزاح' میں اس کے برعکس انسان دوستی اور ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔

'ہجو' کسی وقت ظرافت کی حدود توڑ کر مذمت اور الزام تراشی کے قریب جاتی ہے۔ بہرحال، یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب 'ہجو' کسی ذات کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔ مجموعی طور پر کسی معاشرے یا ادارے پر ہجو گوئی اعلیٰ ظرافت میں شمار ہوتی ہے۔ ارسٹوفینس، بوکاچیو اور سوفٹ نے اپنے اپنے دور کی معاشرتی ریاکاری پر چوٹیں کی ہیں۔ جی بی شا اور ابسن نے جدید معاشرے کی کھوکھلی قدروں کا مذاق اُڑایا ہے۔

فرائیڈ کہتا ہے کہ ظرافت ہمیں جذباتی کشمکش سے نجات دلاتی ہے اور ہنسنے سے جذباتی تشنج دور ہوتا ہے۔

آرتھر کوسلر کہتا ہے کہ ہم کسی واقعہ کے دو پہلوؤں کو زیر غور لاتے ہیں جیسے یہ تعلق استعارے میں مستعار لہ اور مستعار مہ کی صورتوں میں موجود ہے ایسے ہی یہ تعلق مذاق میں دو چیزوں میں پایا جاتا ہے۔

فرائیڈ مذاق کو زیر بحث لاتے ہوئے کہتا ہے کہ لاشعوری واردات ایک دوسرے سے جدا اور مختلف ہوتے ہیں اور منتشر صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ مذاق کرنے والا تیزی سے واردات کا یہ تعلق پاتا ہے اور اس تعلق کا انکشاف ہی مذاق کا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے۔

کالنگ وُڈ کی رائے ہے کہ مزاح میں المیہ اور مزاحیہ دونوں عنصر کچھ اِس

طرح جڑے ہوتے ہیں کہ ہم انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔

مزاح میں دوسروں کے جسمانی نقائیص، شکل وصورت یا لیاقت پر تمسخر نہیں کیا جاتا بلکہ انسان کی عمومی کمزوریوں کو لطیف انداز سے مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ الفاظ کے مفہوم اور فقروں کی ساخت کی اس طرح کانٹ چھانٹ کی جاتی ہے کہ ظریفانہ صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔

ظرافت کثرت اور بعض اور چیزوں سے بدمزہ بن جاتی ہے اور ایسی ظرافت سے حماقت ٹپکتی ہے۔

ظرافت کی ایک اور قسم ہوتی ہے جو دفاعی نوعیت کی ہوتی ہے، انگریزی میں اسے Repartee کہا جاتا ہے۔

بہر حال، میں نے اپنی استعداد کے مطابق روزمرہ پیش آنے والے حالات اور واقعات کو ظریفانہ رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور اس میں احقر کتنا کامیاب رہا ہے اس کا صحیح فیصلہ قاری ہی کر سکتا ہے۔

یہاں ظرافت کے حوالے سے کچھ مثالیں پیش کر رہا ہوں اور امید ہے کہ قارئین انہیں دلچسپ پائیں گے:

بعض حکماء کہتے ہیں کہ احمق کے اخلاق میں، جلد بازی، خفت، سخت مزاجی، غرور، فسق وفجور، بے وقوفی، جہالت، سُستی، خیانت، ظلم، ضیاع، تفریط، غفلت، تکبر، مکاری، جیسی صفات ہوتی ہیں۔ وہ مال دار ہو جائے تو فضول خرچ کرتا ہے۔ تنگ دست ہو جائے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ خوشی ملے تو بداخلاقی کرے۔ اگر بات کرے تو

فحش گوئی کرے۔کوئی مانگے تو کنجوسی دکھائے اور اگر خود مانگے تو پیچھے ہی پڑ جائے۔ اچھی بات نہ کر سکے۔کوئی بات کہی جائے تو نہ سمجھے۔اگر ہنسے تو گلا پھاڑ کر ہنسے اگر روئے تو بھیں بھیں کرے۔

خلیل بن احمد کا ارشاد ہے! لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔ایک وہ شخص جو جانتا ہے یعنی علم رکھتا ہے اور اسی معلوم ہے کہ وہ جانتا ہے یہ شخص عالم ہے۔اس سے علم حاصل کرو۔دوسرا وہ شخص ہے جو جانتا ہے اور اسی نہیں معلوم کہ وہ جانتا ہے تو یہ بھولا ہوا ہے اسے یاد دلاؤ۔ایک وہ شخص ہے جو نہیں جانتا اور اسے معلوم ہے کہ وہ نہیں جانتا، تو یہ طالب ہے، اس کو سکھاؤ اور ایک وہ شخص ہے جو نہیں جانتا اور اسے نہیں معلوم کہ وہ نہیں جانتا، یہ شخص احمق ہے۔اسے چھوڑ دو۔حضرت شعبدؒ سے مروی ہے کہ ہماری عقلیں ویسے ہی تھوڑی ہیں اور جب ہم اپنے سے بھی کسی کم عقل کے پاس بیٹھیں گے تو یہ تھوڑی بھی ضائع ہو جائے گی۔بعض حکماء کہتے ہیں کہ عاقل کا بوجھ صرف اپنے اوپر ہوتا ہے اور احمق کا بوجھ سب لوگوں پر ہوتا ہے۔

حماقت کے تذکرے میں عرب کہتے ہیں ''احمق کبوتر''۔۔۔یہ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ کبوتر اپنے گھونسلے کو درست نہیں کرتا حتیٰ کہ اس کا انڈا ابھی اس میں سے گر کر ٹوٹنے لگ جاتا ہے۔کبھی یہ پرندہ کیلوں پر بھی انڈے دے دیتا ہے جس سے انڈا گر جاتا ہے۔

حماقت کے تعلق سے شترمرغ کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ اگر کوئی شترمرغ کسی دوسرے شترمرغ کے انڈوں کے پاس سے گزرتا ہے تو ان کو سیتا ہے مگر

اپنے انڈے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی دوسری حماقت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ یہ اپنا سر ریت میں دبا کر یہ سمجھتا ہے کہ یہ شکاری کی نظروں سے چھپ گیا ہے۔

قیس ابن ثعلبہ کے قبیلے میں ایک شخص تھا جس کا نام مزید بن ثراوان تھا۔ اسے ابن مروان بھی کہا جاتا تھا۔ اس شخص کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے کوڑی، ہڈی اور ٹھیکرے کا بنا ہوا ایک ہار اپنے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ میں نے اس لئے کیا ہے کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ میں خود کو گم نہ کردوں۔ ہار اس لئے پہنا ہے تاکہ میں خود کو پہچان لوں۔

ایک رات اس کا یہ ہار کسی طرح اس کے بھائی کے گلے میں پہنچ گیا۔ جب صبح ہوئی تو یہ اپنے بھائی کو کہنے لگا کہ بھائی، اگر تو میں ہوں، تو پھر میں کون ہوں؟

ایک دن اس شخص کا اونٹ گم ہو گیا تو اس نے اعلان کیا کہ جسے وہ اونٹ ملے گا، اسی کا ہو جائے گا۔ تو لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر یہ اعلان کیوں کر رہے ہو؟۔ تو اس نے کہا کہ پانے کا ایک الگ ہی مزہ دل میں آجاتا ہے۔

اس شخص کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ جب بکریاں چراتا تھا تو موٹی تازی بکریوں کو چرنے کی جگہ تلاش کر کے دیتا اور کمزور اور لاغر بکریوں کو وہاں سے ہٹا دیتا اور کہتا، جس کو اللہ نے خراب کیا ہو، میں اس کی اصلاح نہیں کروں گا۔

حمزہ بن بیض نے اپنے غلام کو کہا کہ ہم نے رمافہ شہر میں کس دن جمعہ کی نماز پڑھی تھی۔ غلام سوچ میں پڑ گیا اور پھر کچھ دیر کے بعد جواب دیا! منگل کے دن۔

بہت وقت پہلے ''جحا'' نام کا ایک شخص کوفہ عراق میں رہتا تھا۔ اس کی کنیت

ابوالغض تھی۔ یہ حماقت میں ضرب المثل ہے۔کئی مزاحیہ باتیں اس کی طرف منسوب ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے عداوت رکھنے والوں نے اس کے بارے میں جھوٹی حکایات گھڑلی ہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

ابوالحسن سے مروی ہے کہ ایک شخص نے جحا سے کہا کہ میں نے تمہارے گھر سے کچھ آواز سنی ہے تو جحا نے کہا کہ ہاں، میری قمیص اوپر سے گرگئی تھی۔ اس شخص نے حیرت سے پوچھا کہ قمیص کے گرنے سے اتنی آواز؟۔۔۔جس پر جحا نے کہا: ارے احمق، جب میں بھی قمیص میں تھا تو کیا اس کے ساتھ نہیں گرتا۔

ایک دن جحا کے والد نے اسے بھنی ہوئی سری لینے بازار بھیج دیا۔ اس نے سری خرید لی اور راستے میں ہی بیٹھ کر اس کی آنکھیں، کان، زبان اور مغز کھا گیا۔ اور باقی ماندہ سری لیکر اپنے والد کے پاس پہنچا۔ جب والد نے سری کی یہ حالت دیکھ لی تو جحا سے کہا! ''تیرا ستیاناس۔۔! یہ کیا ہے؟''۔۔جحا نے کہا! ''سری ہے، جو آپ نے منگائی تھی۔۔''والد نے کہا! ''اس کی آنکھیں کہاں ہیں؟''۔۔۔جحا بولا! ''بکرا اندھا تھا۔۔''۔۔۔والد نے پوچھا! ''کان کہاں ہیں؟''۔۔جحا نے جواب دیا! ''بکرا بہرا تھا۔۔''۔۔والد نے کہا! ''زبان کہاں ہے؟۔۔''۔۔۔جحا بولا۔۔ ''بکرا گونگا تھا۔۔''۔والد نے پوچھا! ''اس کا دماغ کہاں ہے!۔۔''۔۔جحا بولا۔۔ ''بکرا احمق تھا، اس مین دماغ ہی نہیں تھا۔۔۔''۔۔

بتایا جاتا ہے کہ جحا نے کسی کو کہتے سنا کہ کتنا خوبصورت چاند ہے۔۔!۔۔تو جحا بول پڑا! ''خدا کی قسم، خاص طور پر رات میں کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔۔۔!''

جحا سے کسی آدمی نے پوچھا کہ کیا تم انگلیوں پر حساب لگا سکتا ہے؟۔۔جحا نے کہا! ہاں۔۔تو اس آدمی نے کہا! ''لگاؤ۔۔دو جریب گندم۔۔''۔۔جحا نے چھنگلیا اور اس کے برابر والی انگلی بند کر لی۔ پھر اس آدمی نے کہا! ''دو جریب جو۔۔۔'' تو جحا نے انگھوٹا اور شہادت کی انگلی بند کر لی۔ اور بیچ والی انگلی کھڑی رکھی۔ اس آدمی نے حیرت سے پوچھا! ''تم نے جحا بیچ کی انگلی کیوں کھڑی رکھ لی؟۔۔''تو جحا نے جواب دیا! ''تا کہ جو اور گندم آپسمیں نہ مل جائیں۔۔۔''

ایک مرتبہ جحا کا والد حج کیلئے مکہ جانے لگا تو جحا نے رخصت ہوتے وقت کہا کہ وہاں زیادہ دن نہیں لگانا اور کوشش کرنا کہ قربانی کی عید ہمارے ساتھ گھر پر ہی ہو۔

ضرب المثل بننے والے ایک اور شخص کا نام مزید بھی ہے۔ ابو زید کہتے ہیں کہ مزید کو کہا گیا کہ فلاں گورکن مر گیا تو مزید بولا! جو کسی کیلئے گڑھا کھودتا ہے، خود اسی میں گرتا ہے۔

☆

باقی میں ایک ذرۂ بے مقدار ہوں اور بندشوں سے آزاد ہوں۔

زیر باوند درختاں کو ثمر ہا دارند
اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

[پھل دار درخت زیر بار رہتے ہیں۔ قابل مبارک ہے سرو کہ ہر فکر سے آزاد ہے۔]

بہر حال، کتاب کے تعلق سے عربی کا یہ مقولہ نقل کرتا ہوں:

مَن صَنَّفَ فَقَد استُهدِف

یعنی مصنفین کے زمرے میں شامل ہونا جرح وقدح اور تنقید کے تیروں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے رہنا ہے۔

اِس لئے اُمید کے ساتھ تمنا بھی ہے کہ میرے ضعف اور ناتوانی کو دیکھ کر قارئین کرام اِس کتاب کو پڑھ کر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے، میں گو کہ سینہ تان کر کھڑا ضرور رہوں گا مگر وہ تنقید کے تیر نہ چھوڑیں گے اور مرحبا کے پھولوں سے ہی کام چلائیں گے۔

اپنے کچھ اشعار بھی یہاں درج کر رہا ہوں اور ان کے آخر میں امام شافعیؒ کے اشعار پر اپنی اِن 'چند باتوں' کو اختتام پر لاتا ہوں۔

جو بھی ہے میری کہانی بے سروسامان نہیں
آپ نے جتنے سنائے وہ فسانے خواب تھے
بے مشقت کے یہ لاکھوں سامنے آفت کے ہے
راست بازی میں جو دیکھا چار آنے خواب تھے
وہ لڑھک کر آگئے ہیں راستے کے بیچ میں
جن کے دیکھے ہم نے کل تک آستانے خواب تھے
اپنے دامن کو سمیٹو یوں نہ جلدی دھوپ میں
ہے یہی سایہ تو باقی شامیانے خواب تھے
لعل و گوہر بے بہا دل میں چھپے تھے پالئے

آنکھ نے جو کچھ دکھایا وہ خزانے خواب تھے

اس نشیمن کا وہ پنچھی اب پڑا رنجیدہ ہے

آج پورے ہوگئے اس کے سہانے خواب تھے

ہاں، تذبذب وصل میں ابھرا ہے وعدے توڑ کر

اس کی آنکھوں میں ہمیں ایسے چڑھانے خواب تھے

درد کے سائے میں جس نے کچھ تمازت پائی ہو

ہے کوئی ایسا معبر کچھ بتانے خواب تھے

مدتوں کے بعد گزرا میں وہاں سے خوامخواہ

ہاں، اسی کوچے پہ ٹنگے میرے پرانے خواب تھے

☆

اس جہاں میں کون کس کا سب کے سب اغیار ہیں

گنبد حضرا میں میرے جان و دل سرکار ہیں

میں اگر ڈرتا ہوں تو ہاں حضرت انسان سے

اس طرف تو ہے مصافحہ، اس طرف بمبار ہیں

درد کے لمحات کی دیکھی ہے ان پر بھی گرفت

جو بظاہر عیش و عشرت میں لگے سرشار ہیں

ان کو پایا بستروں میں اور محوخواب ہیں

جن کے بارے میں سنا تھا وہ بڑے ہوشیار ہیں

اب سنائیں حالِ دل کس کو، کہاں ہوگا علاج؟
جو طبیب شہر تھے، وہ سب پڑے بیمار ہیں

نظم

یہ شوق سفر کا نتیجہ بنا
نئی منزلوں کے نشان مل گئے
بدلتا رہا راستہ راستہ
کئی شہر یوں ہی میرے طے ہوئے

تعاقب اُجالوں کا جاری رہا
اندھیروں کے سائے لپٹتے رہے
گزرتے رہے یوں ہی دن اور رات
میری زندگی کے فسانے بنے

چراغوں کی تھی روشنی کچھ اُدھر
شمع بھی نظر آئے تھے کچھ اِدھر
مگر ٹمٹماہٹ کی آوارگی
بڑی بے قراری تھی وہ روشنی
اکیلا چلا تھا اکیلا ہوں میں
میرے حادثے ہیں میرا کارواں

میں خود ہی بناہوں معمہ عجیب!
میں خود سے متعارف نہیں ہوں ابھی!!
میں اک سانحہ ہوں عجیب و غریب!!!

☆

حضرت امام شافعی رحمت اللہ علیہ فرماتے ہے: ۔

ساکتم علمی مَن ذوی الجھل طاقتی
ولا انثر الدر النفیس علی الغنم

[ترجمہ: میں حتی المقدور اپنے علم کو جاہلوں سے پوشیدہ رکھتا ہوں اور نفیس موتیوں کو بکریوں کے سامنے نہیں بکھیرتا ہوں۔]

فان یَسَّرَ اللہ الکریم بفصلے
وَصَادَفت اَھلاَ للعلوم دللحکم

[ترجمہ: پس اگر اللہ کریم نے کوئی آسانی پیدا فرمادی اور مجھ کو کوئی ایسا شخص مل گیا جو علم وحکمت کا اہل ہوتو........]

بَثُثُث مُفِیدَا وَ استَفدت وَدارَ ھُم
والا فمخذون لَدَیّ و مُکتَتُم

[ترجمہ: میں اُس پر علومِ مفیدہ پیش کردوں گا اور خود بھی اس کی دوستی سے فائیدہ حاصل کروں گا۔ ورنہ میرے علوم میرے پاس محفوظ رہیں گے۔]

فَمَنْ مَنَعَ الجُهالَ عِلْماً اَضاعَه

وَمَنْ مَنَعَ المُستَوجِبِينَ فَقَد ظَلَم

[ترجمہ: جس نے جاہلوں پر علم کی بخشش کی اُس نے علم کو ضائع کر دیا اور جس نے مستحقین سے علوم کو پوشیدہ رکھا وہ ظالم ہے۔]

محتاج دُعا

نذیر جہانگیر / ابوالخیر

〈۱〉

ترقی..........

☆

وہ پوچھتے ہیں کہ درد کہاں ہوتا ہے؟۔'' ارے بھائی ایک جگہ ہو تو کہوں یہاں ہوتا ہے۔ !'' میرے اندر درد کی مقدار اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب درد کا overflow ہونے لگا ہے۔ لوگ مجھے دیکھ کر کچھ اس طرح راہِ فرار اختیار کرنے لگے ہیں جیسے میرا قرضہ چکانا ہو۔

یہ درد کچھ اپنے آپ سے ملے، کچھ لوگوں نے دیئے، کچھ وراثت میں آئے، کچھ میری اہلیہ جہیز میں لائی، کچھ سرکار نے زبردستی عطا کئے، کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے آئے اور پھر کل ملا کر درد کا ایسا انبار بنا کہ میری دماغی حالت اُس سنگھ جی جیسے ہو گئی جسے ایک شخص نے کہا تھا کہ سنگھ جی گردوارے میں حلوہ پک رہا ہے تو سنگھ جی بولے تھے'' مجھے کیا۔!'' جس پر وہ شخص بولا تھا مگر سنگھ جی تمہارے لئے بھی تو پک رہا ہے تو سنگھ جی بولے تھے'' تجھے کیا؟''

ہماری ترقی بھی اسی'' مجھے کیا'' اور'' تجھے کیا'' میں ایسی اٹک کر رہ گئی ہے کہ ترقی کا انجن تیل تو کھا رہا ہے مگر ایک قدم بھی آگے نہیں جا رہا ہے۔ جب آدمی کو پتہ ہی نہ ہو کہ آزادی کا مفہوم کیا ہے تو پھر قوموں کا بھی ستیاناس ہو جاتا ہے۔

اب دیکھئے! ایک مسلمان لڑکا بہت ہی قابل اور اہلیت کا مالک ہے۔ انٹرویو میں پاس ہوتا ہے اور اچھی تربیت پانے کے لئے اسے باہر بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر پروگرام رُک جاتا ہے کیونکہ معاملہ ایسا زیر بحث آتا ہے کہ اگر ایک مسلمان لڑکے کو باہر بہتر تربیت کیلئے بھیجا جائے تو سیکولر روایات کا تقاضا ہے کہ

اکثریت کے تناسب کا لحاظ رکھتے ہوئے ہندوئی کا ناطہ بھی اس ٹریننگ سے جوڑ دینا ہوگا۔ چنانچہ ٹریننگ کے اُمیدواروں کی تعداد تین کردی جاتی ہے۔ مگر مسئلہ یہاں ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ سوال بیچ میں ''نمودار'' ہوتا ہے کہ تناسب کے لحاظ سے ٹریننگ کے لئے آدھے سردار کا بھی حق بنتا ہے چونکہ انسان ابھی تک آدھوں میں دستیاب نہیں ہیں (اگرچہ عقل کا معاملہ دوسرا ہے، اُس اعتبار پر ہمارے 'آدھے انسان دستیاب نہیں ہیں' کا فتویٰ نافذ نہیں ہوتا) اِس لئے ایک عدد سردار جی بھی تربیت کی فہرست میں گھس جاتے ہیں۔ چنانچہ اُمیدواروں کی تعداد چار تک پہنچ جاتی ہے۔ سلیکشن کرنے والوں میں ابھی خوشی کی لہر دوڑ ہی رہی ہوتی ہے کہ فہرست کو خدا خدا کر کے حتمی شکل مل گئی کہ اچانک یہ سوال رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے کہ اگر فہرست عورت کی شمولیت سے خالی رہی تو عورتیں ایجی ٹیشن شروع کریں گی۔ عورتوں کا نام سنتے ہی سلیکشن کرنے والوں کی ٹانگیں لرزنے لگتی ہیں، کان کانپ اُٹھتے ہیں، ناک بہنے لگتی ہیں، آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں، ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں اور دانت بجنے لگتے ہیں کیونکہ عورتوں کا خوف اور کمزوری مغرب نے برصغیر کو امداد کے طور Export کیا ہے۔ بہرحال، ایک عورت بھی فہرست میں ٹھونس دی جاتی ہے (اور سلیکشن بورڈ کے تمام ممبران دِل ہی دل میں اس عورت کے ایڈریس کا وِرد کر کے اسے یاد کر لیتے ہیں تاکہ اُس سے مِل کر ذاتی طور مبارک باد دینے کے ساتھ یہ احسان بھی اُس کی یاداشت میں رجسٹر کرواسکیں کہ فہرست میں اُس کی شمولیت دراصل مبارکباد دینے والے کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے)۔ فہرست کو مکمل سمجھ کر سارے لوگ اطمینان کی سانس لیتے ہیں کہ اچانک ایک کی

سانس رُک جاتی ہے۔ اُسے پوچھا جاتا ہے کہ ارے میاں سانس کیوں رُک گئی؟ تو وہ کہتا ہے کہ فہرست ابھی نامکمل ہے اس میں درجہ فہرست ذات یعنی شیڈول کاسٹ کا کوئی آدمی درج نہیں ہے اس لئے اگر فہرست جاری ہوئی تو شیڈول کاسٹ والے اُنہیں نظر انداز کرنے کے خلاف احتجاج کریں گے، یہ لوگ اپنے جسم پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ بھی لگا سکتے ہیں، پھر بلوہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ مطالبہ بھی زور پکڑ سکتا ہے کہ بورڈ کے ممبران کو ہی نکال دو، چنانچہ یہ ہوگا کہ درجہ فہرست ذات کا کوئی نہ کوئی آدمی فہرست کے اندر آئے گا جب کہ ہم میں ہر کوئی بورڈ سے باہر جائے گا۔ اس خدشے پر تمام ممبران متفق ہو جاتے ہیں چنانچہ شیڈول کاسٹ کے ایک آدمی کو بھی فہرست میں ڈالا جاتا ہے۔ امیدواروں کی تعداد چھ تک پہنچ جاتی ہے۔ اب میٹنگ میں مچھلی بازار کا ساسماں بندھ جاتا ہے۔ شور، چیخیں، گالی گلوچ، اور بھی بہت کچھ .... کیوں اور کیا ہورہا ہے، اسے آف دی ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک گُجر ممبر اس بات پر اُچھل کود کرتا ہے کہ فہرست میں ایک گُجر بھی ٹھونس دو۔ ٹھونس دیا جاتا ہے۔ لداخی بولتا ہے، ایک لداخی بھی۔ لداخی بھی ڈالا جاتا ہے۔ ڈوگرہ بولتا ہے فہرست میں ڈوگرہ نہ ہوگا تو ریاست میں تقسیم کاری کی تحریک چلے گی۔ ڈوگرہ فہرست میں داخلہ پاتا ہے۔ آہستہ آہستہ فہرست میں اُمیدواروں کی تعداد ایک درجن کے برابر ہوجاتی ہے۔ فہرست سرکار کے پاس جاتی ہے۔ سرکار کہتی ہے کہ فائنانشل کرنچ ہے۔ اور ٹریننگ کا پروگرام منسوخ ہوجاتا ہے۔

بہرحال اپنا خیال رکھئے گا ....!

نہ زَانُن گو قہرَ خدا

☆

مراز کے ایک دیہات میں کمال صاحب ہوا کرتا تھا، عمر رسیدہ۔ مقامی لوگ اُس کی عمر سو سال سے زیادہ بتاتے تھے۔ بوڑھاپے کے تھپیڑوں نے جہاں کمال صاحب کے جسم کا جغرافیہ بدل دیا تھا وہاں اُس کی توانائی بھی ''یادِ ماضی'' بن گئی تھی۔ اپنے یہاں یہ روایت ہے کہ جب کوئی آدمی اس حال پر پہنچ جاتا ہے تو اُسے اپنے پرائے یہاں تک کہ ایرے غیرے اور نتھو خیرے بھی کوئی اجلاس بلائے بغیر اور کسی تقریب کا اہتمام کئے بغیر ''بے چارہ'' کا لقب و اعزاز اس طرح عطا کرتے ہیں کہ یہ بن مانگا تخلص اُس کے نام سے لازم و ملزوم کے روپ میں جُڑ جاتا ہے۔ بہر حال یہ روایت کمال صاحب کے ساتھ بھی روا رکھی گئی تھی۔ بے چارہ کمال صاحب......!

ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ..... کہیں سے ایک اونٹنی آئی اور اسی دیہات کے ایک بڑے درخت کے پاس جم کر بیٹھ گئی۔ علاقے کے لوگوں نے اس سے پہلے کبھی ایسا جانور نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اس اونٹنی کو دیکھا تو جہاں حیرت میں پڑ گئے وہاں گھبرا بھی گئے۔ کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا کہ یہ کیا ''بلا'' ہے؟ ہر کوئی اپنی اپنی استعداد کے مطابق دماغ لڑاتا رہا، بچپن میں دادی اماں اور بزرگوں سے سنے ہوئے قصوں اور کہانیوں میں جھانکنے لگا کہ شاید ایسی کسی ''بلا'' کا تذکرہ ان کہانیوں سے جڑا ہوا ملے اور وقت و واقعات کی ''دھکم پیل'' میں یاداشت کے کسی خانے میں روپوش ہوا دریافت ہو..... مگر اس ''بلا'' کی تصویر کسی

ذہن کے دھند لکے سے اُبھر نہ سکی۔ آخر جب سوچ کے تمام حربے ناکام ہوئے تو لوگوں کا اتفاق اس رائے پر ٹھہر گیا کہ ہمیں اس ''بلا'' کے متعلق کمال صاحب سے رجوع کرنا چاہیئے، ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کمال صاحب اس ''جنس'' سے واقف نہ ہوں۔! سب نے حامی بھر لی اور پورا ''بحران'' حل ہوتا ہوا نظر آیا۔

چنانچہ لوگوں کا پورا ہجوم نہایت ہی جوش وخروش اور کمال عقیدت کے ساتھ کمال صاحب کے پاس گیا اور اُن سے کہا کہ حضرت کوئی بلا وارِد دیہات ہوئی ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی اور دماغ پر بھی سرتوڑ محنت کی کہ اس بلا سے کوئی شناسائی نکل آئے مگر حضرت یہ بلا ایسی ہے کہ نہ اس کے بارے میں کبھی سنا ہے، نہ سوچا ہے اور نہ بولا ہے۔ اب حضرت کی خدمت بابرکت میں یہ منشا لے کہ حاضر ہوئے ہیں کہ حضرت ہی اپنے تجربات، فہم دفراست اور عقل ودانش سے کام لے کر یہ معمہ حل کرلیں تاکہ ہم اُن ناکردہ گناہوں کی سزا سے نجات پاسکیں جو اس بن بُلائی بَلا کی تشریف آوری سے ہماری تمام مصروفیات کو چوس رہے ہیں۔ یہ سب تقریرِ بے مثال سننے کے بعد کمال صاحب نے ہجوم سے کہا کہ مجھے اُس بلا کا آپ لوگوں کو تفصیلی تعارف دینے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اس کیلئے آپکو کسی پالکی کا انتظام کرنا ہوگا جو مجھے اُس جگہ تک پہنچا سکے جہاں پر یہ بَلا ڈیرہ ڈالے ہوئی ہے۔

پالکی لائی گئی، کمال صاحب اس میں سوار ہوئے اور مقام صحیح تک پہنچائے گئے۔ کمال صاحب نے اونٹنی کو دیکھا، بغور دیکھا اور پھر غور سے جائزہ لیتے رہے۔ ایک گھنٹہ تک اس شغل کو جاری رکھنے کے بعد اُنہوں نے آنکھیں دوسری طرف پھیر

لیں اور یوں رونا شروع کر یا کہ آنسوؤں کی داڑھی کی مسافت طے کرنے کے بعد دھڑ ادھڑ قطروں کی صورتوں میں سر کے بل گرتے رہے۔ اس مرحلہ بے تکلف سے فراغت پا کر کمال صاحب پر ہنسی کا ایسا بھوت سوار ہوا کہ وہ خود ہی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ اِن تمام مصرفیات سے جب کمال صاحب فارغ ہو گئے تو لوگوں سے کہا کہ اب مجھے گھر واپس لے چلو۔ ہجوم حیران تھا کہ کمال صاحب ہنسے بھی روئے بھی اور کوئی وجہ بتایا بھی نہیں۔ تو اب یہ کیسے ممکن تھا کہ ہجوم جو پہلے ہی اونٹنی کے معمہ سے پریشان تھا کمال صاحب کے رونے ہنسنے کی دوسری پہیلی سے مزید پریشان ہونے پر آمادہ ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ہجوم نے ہمت باندھ لی اور کمال صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ حضرت آپ کو واپس گھر پہچانا ہماری ذمہ داری رہی مگر حضرت ہمیں پہلے اس پریشانی سے نکال لیجئے کہ یہ جو آپ روئے تو کس بات پر؟ اور پھر یہ جو آپ ہنسے تو کس بات پر؟ جس پر کمال صاحب نے بڑی ہی صاف گوئی سے کام لے کر اُن سے کہا کہ میرے عزیزو! رویا تو اس بات پر کہ اگر میں زندہ نہ ہوتا تو آج پریشانی اور مصیبت کے اِس وقت میں آپ کیا کرتے اور کہاں جاتے! بس اِسی خیال نے مجھے رُلا دیا۔ لوگوں نے پوچھا مگر ہنسے کس بات پر؟ تو کمال صاحب بولے کہ میرے عزیزو! ہنسا تو اس بات پر کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ یہ (اونٹنی) کونسی بَلا ہے....؟!!

کمال صاحب جیسے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ آپ کے دائیں بھی ہیں اور بائیں بھی ہیں۔ بس آپ ایک کام کیجئے کہ اپنا خیال رکھئے گا.......!

﴿۳﴾

شیطان اور تصویر

☆

گذشتہ دنوں اچانک اور غیر متوقع طور شیطان سے یونہی مُد بھیڑ ہوئی۔ بات دراصل یوں ہوئی کہ میں نے اُسے برف پر سکیٹنگ کرتے دیکھا تو پوچھا:

''ارے او شیطان۔تو تو بڑی فراغت میں نظر آ رہا ہے! پہلے تو تُو بڑا ہی عدیم الفرصت ہوا کرتا تھا۔آخر یہ تو بتاؤ کہ ماجرا کیا ہے؟''

پہلے شیطان خاموش رہا۔مگر جب میں نے دوبارہ پوچھا تو مردود سہم گیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے کچھ وقت پہلے کئی بار اس کی یونہی جم کر پٹائی کر دی تھی۔تب سے بد بخت نزدیک یوں بھی نہیں آتا اور مجھ سے خوف کھاتا ہے۔بولا:

''میاں اب تو میرا چارج ٹیلی ویژن نے لیا ہے۔ میں بہت راحت میں ہوں۔ میں جو کام صدیوں میں نہ کر سکا وہ یہ آلہ دنوں میں کر گیا۔اب میں آجکل آٹو بیگرافی لکھ رہا ہوں۔ اور ارادہ ہے اسے مکمل ہونے پر ٹیلیویژن سے سلسلہ وار ٹیلی کاسٹ کروالوں گا''۔

بات تو شیطان نے پتے کی کہی اور اس کا ثبوت بھی میرے سامنے تھا پھر بھی میں نے ازراہ یونہی پوچھا۔''دشمن خدا۔ٹیلی ویژن تو ہماری ترقی کی نشانی ہے۔یہ ہمیں نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔تفریح بہم پہنچاتا ہے اور دنیا کی خبریں سناتا ہے۔یہ مشین انسان کے لئے نافع ہے۔ضرر رساں کہاں؟''

شیطان نے قہقہہ مارا اور پھر یونہی جوش میں آکر نعرہ مارا ''ٹیلی ویژن زندہ باد''۔

میں نے شیطان کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی اس حالتِ شادمانی پر متحیر ہوا اور پوچھا:

''تمہیں اپنے خالق کی قسم۔ آج سچ بتاؤ کہ تم نے قہقہہ کیوں مارا؟''

شیطان کے چہرے پر زردی چھاگئی۔ بولا:

''تم نے مجھے خالق کی قسم دی ہے۔ اس لئے پہلی بار سچ کہہ رہا ہوں۔ ہنسنے کی وجہ یہ تھی کہ تم میرے جال میں کبھی نہیں آئے اور جہاں میں ناکام رہا وہاں ٹیلی ویژن کام کرگیا۔ یہ ٹیلی ویژن کی جادونظری کا ہی اثر ہے کہ تم اس کی تعریف میں دلائل دے رہے ہو ورنہ سچ تو یہ ہے کہ جسے تم ترقی کی نشانی کہتے ہو وہ تو حقیقت میں تمہاری ترقی کے نشان مٹا رہا ہے۔ یہ نشانی تمہیں اپنی منزل سے دور لے جارہی ہے۔ جنہیں تم معلومات کہتے ہو۔ وہ تمہیں معمولات سے غافل کررہے ہیں۔ ان فحش اور بے مقصد معلومات کے وسیلے تمہیں غفلت نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔ تم اپنی شناخت اور خالق کی پہچان معلوم کرنے کے بجائے بے راہ روی کی اطلاعات کو معلومات کہہ رہے ہو۔ اب جسے تم تفریح کہتے ہو وہ ذہنی عیاشی کا ایسا نشہ ہے جس میں بدمست ہو کر انسان کو اپنی بیوی اور بیٹی کی عریانیت بھی نظروں سے اُوجھل رہتی ہے اور کوئی غیرت اُس کے ضمیر پر دستک نہیں دیتی۔ رہی پوری دنیا کی خبروں کی بات۔ وہ تو ایسی مثال ہوئی: رہنے کو گھر نہیں سارا جہاں ہمارا''۔

یہ کہہ کر شیطان نے برف پر سکیٹنگ کی دوڑ لگائی اور روپوش ہوگیا۔

واقعی شیطان سچ کہہ رہا تھا۔ یہ ٹیلی ویژن کا ہی اثر ہے کہ معاشرے میں حیا بالکل اسی طرح غائب ہوگئی ہے جیسے بازار میں ایک، دو اور پانچ کے نوٹ۔ بازار میں جیسے ریز گاری نظر نہیں آتی ویسے ہی معاشرے میں حیا کا فقدان ہے۔ بس کنڈکٹر کو دو روپے کے کرائے پر دس کا نوٹ دو 'چینج نہیں ہے صاحب' کے ڈائیلاگ پر باقی پیسے ہڑپ کر جاتا ہے۔ اور بے حیائی کو چالاکی سمجھتا ہے۔ اگر کسی باحیا نے آہنی ارادے کا مظاہرہ کر کے ریز گاری نہ چھوڑی اور باقی پیسوں کے لئے انشورنس ایجنٹ کی طرح پیچھے پڑ گیا تو کنڈکٹر ہاتھ میں دس کا نوٹ تھما کر چار پانچ سواریوں کے بقایا جات اسی نوٹ سے جوڑ دیتا ہے اس طرح ایک نئی ایسوسی ایشن معرض وجود میں آتی ہے اور پھر بقایا جات کی تقسیم کاری کے لئے نوٹ کے چینج کی پورے شہر میں تلاش ہوتی ہے۔ نئی ایسوسی ایشن کو راستے میں نئی دریافتیں ہوتی ہیں مگر ریز گاری نہیں ملتی۔ پھر ان بقایا جات سواریوں کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس طرح جڑ جاتا ہے کہ میاں بیوی میں نکاح ٹوٹ سکتا ہے مگر نوٹ کے ساتھ وابستہ سواریوں کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ یہ ایسوسی ایشن نوٹ لے کر سڑکوں پر گشتی پریڈیں کرتی ہے مگر نوٹ کا چینج نہیں ملتا۔ یہی حال ٹیلی ویژن نے ہماری حیا کا بنا دیا ہے۔ بے غیرتی اور گستاخیاں عروج پا رہی ہیں۔ اب دیکھئے۔ بس سواریوں سے بھری پڑی ہے اور ایک شخص سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے چھوڑ رہا ہے اور بڑی بے حیائی سے باقی سواریوں کو تکلیف پہنچا رہا ہے۔ اس طرح نئی تہذیب اور نئے زمانے کے اخلاق کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ جدیدیت کی

دلدارہ عورتیں اپنے فیشن کے مظاہرے سے انگریزی حیا کی وہ روایات قائم کر رہی ہیں کہ باحیا لوگ اب دوزخ سے زیادہ ان عورتوں سے خوف کھانے لگے ہیں۔ دن میں سینکڑوں ہوس پرست نگاہوں سے اپنے جسم کی عصمت لٹانے کے باوجود اُن کی غیرت پر جوں تک نہیں رینگتی۔

واقعی ٹیلی ویژن نے وہ کر دکھایا جو شیطان بھی نہ کر سکا۔

بہرحال اپنا خیال رکھئے گا۔۔!

﴿۴﴾

اُونچی سوسائٹی کے اُونچے لوگ

☆

ہر کوئی بڑا بننا چاہتا ہے تا کہ دوسرے کو نیچا دکھا سکے۔ یہ جنون انسانی شعور پر اس طرح سوار ہے کہ انسان اپنی شناخت بھی بھول گیا ہے۔ اور اُس نے بیل گاڑی کا روپ دھار لیا ہے۔ بے چارہ محض مادی فائدوں کے لئے اپنی زندگی کے ٹائیر گھسا رہا ہے۔ پھر جب موت دبوچ لیتی ہے تو خسیرہ دنیا والآخرۃ کے سوا اور کوئی ''پونجی'' ساتھ نہیں ہوتی۔

ایک انجینئر صاحب تھے۔ اُس کے دو بچے تھے۔ یعنی فیملی ''ہم دو ہمارے دو'' کا پورا ''سیٹ'' تھا۔ فیملی پلاننگ کی ''جسمانی کانٹ چھانٹ'' پر سرکار سے ''ایڈوانس انکریمنٹ'' بھی وصول کی تھی۔ بہر حال بچوں کو بڑا ہونا تھا سو ہو گئے۔ انجینئر صاحب نے اپنے رشتہ داروں کو ذرا اُن کی پسماندگی کا احساس دلانے کے لئے اپنے ان دو بچوں کو کانوینٹ اور برن ہال میں داخلہ دلوایا۔ رشتہ دار ذرا مذہب ٹائپ کے تھے اس لئے انجینئر صاحب کی نظروں میں پسماندہ تھے۔ مشنری سکولوں میں داخلے کے لئے انجینئر صاحب کو بہت پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ اپنی بیوی کو پسماندگی کے خول سے نکالنے کے لئے پہلے اُس کے بدن سے برقعہ اور پھر سر سے ڈوپٹہ بھی اُتارنا پڑا۔ پھر بے چاری کا سر بھی سلامت رہنے نہیں دیا بلکہ ہیئر سٹائیل چینج کروانے کے لئے بار بار اُسے نائیوں کی دکانوں (جنہیں ''اُونچی سوسائیٹی'' کی اصطلاح میں

Beauty Parlours بھی کہا جاتا ہے) لے جانا پڑا۔ پھر بھی انجینئر صاحب کی

تشفی نہ ہوئی اور پسماندگی کا بھوت برابر پریشان کرتا رہا۔ چنانچہ بیوی کے لئے وہ باریک کپڑے بنوائے کہ شیطان کو بھی استغفار یاد آیا۔ اب تو انجینئر صاحب کے گھر پر دوستوں کا تانتا بندھا رہنے لگا۔ علاقے کے خاکروب نے تو انجینئر کے مکان کے صحن کی صفائی کو مقصد حیات ہی بنالیا۔

جب انجینئر نے دیکھا کہ علاقے کے خاکروب سے لے کہ اُس کے چیف انجینئر تک وہ اب ''قدر'' کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو تسلی ہوئی کہ اب پسماندگی باقی نہیں رہی ہے۔

پھر وہ دن آ ہی گیا جب ''وہ'' آتا ہے۔ ''وہ'' جو حریر و دیبا میں ملبوس شہنشاہ کے پاس بھی آتا ہے۔ وہ مرد ہو یا عورت، گنہگار بندہ ہو یا عبادت گزار زاہد ''وہ'' سب کے پاس ایک دن اچانک آتا ہے۔ بڑا بے رحم ہے ''وہ''۔ کوئی مہلت نہیں دیتا اور گرفتار کر کے اپنے ساتھ جانے کہاں کہاں لے جاتا ہے۔

چنانچہ اُس نے سماعت کے مائیک پر انجینئر کی روح کو حکم دیا کہ جسم سے باہر آجا۔ روح کانپ اُٹھی، جسم لرز گیا۔ انجینئر بہت چیخا چلایا۔ بیوی کو بہت پکارا مگر وہ بے چاری وسیع بنگلے کے ایک اونچے کمرے میں ذرا میک اپ میں مگن تھی۔ انجینئر چلاتا رہا، روتا رہا، بیوی کو پکارتا رہا مگر اُس کی بیوی کی نگاہیں آئینے میں اپنی صورت پر کچھ ایسی مرکوز تھیں کہ محویت کے عالم میں سماعت کے پردے بھی جیسے بے کار ہو گئے تھے۔ اُس کے ذہن کے دھندلکوں سے بے حیائی کی تصویریں اُبھر رہی تھیں۔

بچے کسی دوسرے کمرے میں ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ اس لئے انجینئر کی آوازوں سے وہ بھی ''ڈسٹرب'' نہیں ہوئے۔ انجینئر کو چکر پہ چکر آنے لگے اور پھر ایسا چکر آیا کہ روح نے بھی جسم سے تعلق توڑ دیا۔ مگر ''وہ'' تھا کہ بھلا چھوڑنے والا کہاں تھا۔ قبر میں اُس کا کریک ڈاؤن کیا گیا اور پھر اعمال کی شناختی پریڈ ہوئی۔ بے چارے نے دنیا میں گھاٹے کا سودا کیا تھا اس لئے محض خسارے کا بجٹ دیکھا۔ پہلے اُسے جنت دکھائی گئی تو دل اُچھل پڑا۔ فرشتوں نے پوچھا: کیا تمہارے پاس یہاں کے محل، باغات اور حوریں خریدنے کے لئے مال ہے؟

انجینئر بولا ''دنیا میں بہت ہے۔ میری تجوری میں بہت روپے، سونا اور چاندی ہے۔ آپ مجھے بس دو منٹ دنیا میں واپس بھیج دیجئے۔ میں وہ سارا مال آپ کے قدموں میں ڈال دونگا۔ آپ اُس کے بدلے مجھے بس جنت کے ایک پیڑ کے نیچے ستانے کی اجازت دیجئے۔ فرشتے مسکرائے اور کہا: ''ارے کم بخت! یہاں اُس مال کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہاں نیکیوں کی کرنسی چلتی ہے۔ پانچ ہزار نیکیوں میں ایک باغ ہے۔ دو ہزار نیکیوں میں ایک محل ہے۔ دس ہزار نیکیوں میں ایک حور ہے۔ کیا ہے تمہارے پاس یہ کرنسی؟''۔ انجینئر لاجواب ہوگیا۔ چنانچہ اُسے پھر وہاں قید کر دیا گیا جہاں کے قیدی بننے سے اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو بچائے۔

بہر حال اپنا خیال رکھئے گا۔۔!

ادھر سے اُدھر تک

☆

جب کوئی انہونی بات پہلی بار رونما ہو جائے تو ''سنسنی'' بن جاتی ہے۔ اگر اسے دُہرایا گیا تو ''حیرت'' بن جاتی ہے بار بار دہرائی جائے تو ''عادت'' بن جاتی ہے۔ ''بڑے لوگوں'' نے اپنالی تو ''فیشن'' بن جاتی ہے۔ عام ہو جائے تو ''رواج'' بن جاتی ہے۔ یہی حال کورپشن اور ناجایز منافع خوری کا ہوا اور یہ دونوں باتیں ''رواج'' بن گئیں۔ ہم نے اپنی موت کا سامان خود پیدا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرینگر جموں شاہراہ صرف شاہراہ نہیں، ہماری شہہ رگ بن چکی ہے۔ جب شاہراہ بند ہو جاتی ہے تو ہماری زندگی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ شالی کے کھیتوں پر سیب کے باغات بنائے گئے اور سیب کے باغات پر بنگلے تعمیر کئے گئے۔ جہاں سبزی پیدا ہوتی تھی، وہاں چمن سجا دئے گئے۔ جہاں کارخانوں کی ضرورت تھی، وہاں دُکانیں بن گییں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بچوں کے سوا اور کچھ پیدا کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ جب وادی میں تاجروں کا ''دھندا'' کچھ کچھ ''مندہ'' پڑ جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ''خداوندا'' تمہارا یہ ''بندہ'' پھر سے وہی ''جندہ'' نہ پہن لے جو اس نے کب کا چھوڑ دیا ہے۔ ''خداوندا'' سرینگر جموں شاہراہ کو کچھ دنوں کیلئے بند کرنے کا سامان کرو ورنہ ''غریبی کا پھندا'' پھر گردن میں آجائیگا۔ اپنی حکومت تو ''کاغذ کا پلندہ'' ہے جو صرف قومی خزانے سے ''چندہ'' وصول کرتی ہے۔ لوگ جائے جہنم میں، منسٹر تو ''تابندہ'' ہیں جو ''پائندہ

پندہ'' کر کے صرف تجوریاں بھرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں کوئی ''مشٹنڈہ'' باقی نہیں ہوتا۔ کرپشن نے ہمارے سماج کے سارے تالاب کو'' گندہ'' کر دیا ہے اور صرف ''فندہ'' کا چلے چلاوہ ہے۔ ''آیندہ'' کا کسی کو خیال نہیں۔ میرے بھائیو! بات ہو رہی تھی فیشن کی۔ اپنے یہاں کچھ لوگوں نے مذہب کو بھی فیشن بنا دیا ہے اور یہ لوگ مذہب پرست سے زیادہ فیشن پرست نظر آتے ہیں۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا!

ڈاکٹر فاروق گانا بجانا سیکھ لیں گے

☆

کچھ دن پہلے وزیراعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ایک بھری مجلس مین یہ اعلان کیا کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہو جائیں گے اور پھر گانا بجانا سیکھ لیں گے۔ ڈاکٹر فاروق کے لئے شاید یہ بات غیر متوقع ہو گی کہ اُن کے اس اعلان پر کسی بھی خدا کے بندے کو کوئی اچنھبا نہیں ہوا بلکہ لوگوں کا بیان ہے کہ اپنے پیارے پیارے راج دلارے وزیراعلیٰ اور اُن کی کابینہ کے چاند ستارے چھکری بجانے کے سہارے ہی کام نبھا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انتظامیہ بھی بے سُر ہو گیا ہے اور اب پورا کشمیر چیخ و پکار کا ڈسکو سنگیت بجا رہا ہے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کو جو کام بہت پہلے کرنا تھا اُسے اب سیکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بہر حال، صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے، دیر آید دُرست آید۔ گانا بجانے کے لئے جن ''سازندروں'' کی ضرورت ہوتی ہے اُن کی ایک بڑی فوج ڈاکٹر فاروق کے ارد گرد پہلے ہی جمع ہے اور اب صرف گانا بجانے کی دیر ہے۔ اطمینان رکھئے! عوام آپ کو اس شوق میں بھی پورا ساتھ دیں گے۔ آپ طبلہ بجائیں گے، وہ اپنے خالی پیٹ بجائیں گے۔ وہ صرف آدھی روٹی کھائیں گے مگر آپ کا سر نہیں جھکائیں گے۔ آپ گٹار بجائیں گے تو وہ بے لباس ناچیں گے، گھومیں گے اور گائیں گے '' آئی مِلن کی بیلا دیکھو آئی۔۔۔''۔ اور پھر جب اچانک گولیوں کا سنگیت بج اُٹھے گا تو اسی سنگیت کے طرز پر لوگوں کے یہ

گیت بلند ہوں گے۔ ''ہائے! میرا بیٹا مر گیا۔ ہائے! میرے منگیتر کو گولی لگی۔ ہائے! میرا کمسن بھائی تڑپ رہا ہے۔'' نوجوانوں کا گرم گرم لہو سڑکوں پر پھیل جائے گا اور فضا میں ایک اور گیت اُبھریگا۔ ''ہولی آئی رے آئی رے۔ آئی رے''۔ گیت و سنگیت کے یہ تماشے کشمیر میں بہت برسوں سے جاری ہیں۔ غالباً یہی تماشا دیکھ دیکھ کر فاروق صاحب کو گانا بجانے کا فن سیکھنے کی تحریک ملی ہو۔ تاہم ڈاکٹر صاحب نے اپنے اعلان میں اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ وہ کس قسم کی موسیقی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیا وہ پوپ سنگر بننا چاہتے ہیں؟۔ کیا اُنہیں کلاسکیی سنگیت کا شوق ہے؟ یا وہ چھکری بجانے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟ بہر حال، وہ جو بھی سیکھنا چاہتے ہیں ان معاملوں میں یہاں کی پولیس اُن کی صحیح رہبری کر سکتی ہے کیونکہ اپنی پولیس سنگیت بجانے کے معاملے میں کافی شہرت پا چکی ہے۔ ہماری پولیس جب اپنے ڈنڈوں سے لوگوں کے سروں کو بجاتی ہے تو واہ! کیسے مدر گیت فضا میں گونج اُٹھتے ہیں۔ گولیوں کا سنگیت بجانے میں بھی اپنی پولیس کو بڑی مہارت ہے۔ ٹیر گیس گولوں کا میوزک تو وہ آئے دن بجاتی رہتی ہے۔

بہر حال، میری دعائیں اور نیک تمنائیں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہیں اور ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ گانا بجانے میں بھی اونچا مقام حاصل کریں۔

ڈاکٹر فاروق صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ یورپی ممالک میں ڈاکٹر ریٹائیر نہیں ہوتے اور یہاں یہ روایت سیاستدانوں نے اپنائی ہے۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

دیوانگی

☆

میں اکثر سڑکوں پر گھومتا رہتا ہوں۔ بس یونہی، بے مقصد۔ سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میں گھومتا پھرتا ہوں بے مقصد۔ لوگوں کو دیکھتا ہوا، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں۔ لوگوں کی چہل پہل میں ایک نوجوان سے پوچھتا ہوں:
''تم کہاں جا رہے ہو؟''۔ تو وہ جواب دیتا ہے۔ ''مجھے ۶ ہزار روپے کی تلاش ہے، پولیس میں بھرتی ہونا ہے اور میں نے سُنا ہے کہ وہاں ۶ ہزار روپے دیکر اُمیدواروں کی لسٹ بھی تبدیل کی جاتی ہے۔ میں کئی برسوں سے بیروزگار ہوں ۶ ہزار روپے نہیں مل رہے ہیں''۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ بس میں چڑھتا ہوں۔ بس چل دیتی ہے۔ میں اپنی پتلون کی جیب میں کسی کے ہاتھ ڈالنے کی حرکت کو محسوس کرتا ہوں۔ میں اُس ہاتھ کو پکڑ لیتا ہوں۔ جیب کترے کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ میں جیب کترے سے پوچھتا ہوں۔ ''اُلو کے پٹھے! تم تو جیب کاٹنے میں بالکل اناڑی ہو۔ کس احمق نے تمہیں چوروں کی منڈلی میں بھرتی کرا لیا ہے؟''۔ تو وہ جواب میں کہتا ہے۔ ''جناب میں سفارش سے بھرتی ہوا ہوں''۔ میں بس سے اُتر جاتا ہوں۔ پھر سڑکوں پر گھومتا ہوں۔ بس یونہی! بے مقصد! میری جیب میں ۵ روپے کا نوٹ ہے۔ میں بیڑی کا پیکٹ خریدنے جاتا ہوں۔ دُکاندار کہتا ہے چینج نہیں۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے دُکاندار سے بھی یہی جواب ملتا ہے۔ پھر میں ایک بھکاری کے پاس جاتا

ہوں۔ ۵ روپے کا نوٹ اُس کی طرف بڑھا کر کہتا ہوں۔ ''تم اس میں چار آنے رکھ لو اور پونے پانچ واپس دیدو۔'' بھکاری جواب دیتا ہے: ''تم دو گھنٹے کے بعد آ جاؤ، اس وقت میرے لنچ کا وقت ہے۔'' میں کہتا ہوں: ''مگر تمہیں لنچ میں وقت ہی کتنا لگے گا۔ دس پندرہ منٹ نا! تب تک میں یہیں انتظار کرتا ہوں۔'' بھکاری کہتا ہے: ''لنچ کے بعد میں قیلولہ کرتا ہوں اس طرح میرا لنچ پورے دو گھنٹے بعد ہی ختم ہوتا ہے''۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ سامنے ایک سکول ہے۔ ماسٹر بچوں سے کہتا ہے: ''دُنیا میں سب سے تیز دوڑنے والا جانور چیتا ہے۔'' تو ایک بچہ کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔ ''ماسٹر جی کبھی کبھی انسان بھی جب اُس کے پیچھے پولیس ہو۔'' میں وہاں سے چل دیتا ہوں، قدم آگے بڑھاتا ہوں۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

صرف بالغوں کیلئے

☆

فیشن کی وبایوں تو پوری دُنیا میں پھلی پھولی ہے لیکن جس سختی اور شدت سے اس وباء نے ہماری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اُس پیمانے پر باقی دُنیا اس کی زد میں نہیں آچکی ہے۔ غور سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہم فیشن بھی ''درآمد'' کرتے ہیں اور باقی دُنیا اسے ہماری وادی میں ''برآمد'' کرتی ہے۔ البتہ فیشن کی اس ''درآمد'' میں یہ خوبی اور خاصیت ہے کہ ہم اسے اضافے کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور فیشن کے معاملے میں ہم نے زبردست ترقی کر لی ہے اور اسے یہاں بہت ہی فروغ ملا ہے۔ یوں تو ترقی ہم نے دیگر شعبوں میں بھی کی ہے اور ریکارڈ توڑ حد تک کی ہے۔ دیکھئے! پہلے اپنی پیاری پیاری خوبصورت سی وادی میں بجلی ہفتے میں ایک دن بند اور چھ دن چالو رہتی تھی۔ پھر ترقی کی رفتار بڑھ گئی اور اس حد تک بڑھ گئی کہ اس رفتار نے بجلی کو بھی مات کر دیا۔ اب حال یہ ہے کہ ہفتے میں بجلی چھ دن بند اور ایک دن چالو رہتی ہے۔ میں نے جب بجلی ڈیپارٹمنٹ کے ایک بڑے آفیسر سے ترقی کی اس رفتار پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی درخواست کی تو اُس نے کہا کہ پہلے مٹھی میں پیسے لیتے تھے اور تھیلے میں شکر لاتے تھے۔ پھر زمانے نے ترقی کر لی اور ترقی کی رفتار بڑھ گئی اور اب تھیلے میں پیسے لیتے ہیں اور مُٹھی میں شکر لاتے ہیں۔ بہر حال بات ہو رہی تھی فیشن کی جب نیا فیشن انگڑائی لیتا ہے تو سٹائیل بھی خود بخود بدل جاتے ہیں یا یوں بھی کہا جا

سکتا ہے کہ جب سٹائیل نیا روپ اختیار کرتا ہے تو فیشن بن جاتا ہے۔ سٹائیل، فیشن
ہماری وادی میں باہر سے آتے ہیں اور ہم اس میں اضافہ کر کے اپنا لیتے ہیں۔ آپ کو
یاد ہوگا کہ جب بال بڑھانے کا یہی فیشن باہر عام ہوگیا تو ہم نے یہاں اپنے سروں
کے بال اتنے بڑھادئے کہ ''اُڈ گز یار باش کے بارہ گز بال'' ہوا کرتے تھے۔ آوارہ اور
اوباش قسم کے لوگوں کی جب ان عورت نمامردوں سے دست درازیاں بڑھ گئیں اور
بیویوں کی آبرو خطرے کی زد میں آگئی تو یار باشوں نے بال کاٹنے میں ہی عافیت سمجھ لی
کیونکہ اُن کی عزت کے لالے پڑ گئے تھے۔ پھر وقت آیا اور بیل باٹم کا فیشن عام
ہوا۔ ہمارے نوجوان اس فیشن میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ پتلونوں کی تہ کو اتنا کشادہ کر دیا
گیا کہ خاکروبوں نے سڑکوں کی صفائی چھوڑ دی کیوں کہ یہ کشادہ پتلونیں جھاڑو کا کام
دیکر سڑکوں سے کوڑا کرکٹ صاف کر دیتی تھیں۔ تنگ فراک کا فیشن چل نکلا تو یہاں کی
قلہ پطراؤں نے لباس کو اتنا ٹائیٹ کر دیا کہ اُن کے جھکنے پر فراک تارتار ہو جاتے اور
ٹریفک جام ہو جاتا۔ نوجوانوں کی بھیڑ لگتی اور دل پھینک نوجوان موقعے کا فائدہ
اُٹھاتے۔ جب ٹائیٹ فراکوں نے یہاں لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیا تو نئے زمانے
کی لاڈلی ''دلہنوں'' کو تھوڑا بہت احساس ہوا اور ڈھیلے کپڑوں کا فیشن قبول کر لیا گیا۔
کُرتا اتنا ڈھیلا ہوا کرتا تھا کہ جب کوئی حسینہ سڑک پر چلتی تو صاف نظر آتا تھا کہ جو اندر
ہے اپنے آپے میں نہیں ہے۔ منچلے نوجوانوں کی آہیں بُلند ہوتیں اور لڑکیوں کے پیچھے
پیچھے نوجوانوں کے جلوس نظر آتے۔ ان حالات نے یہاں ٹریفک حادثات کے
امکانات بڑھادئے تھے کیونکہ ایسے جلوس ٹریفک جام کا سبب بن گئے تھے۔ خدا خدا کر

کے اس فیشن سے بھی جان چھوٹی

اب بیسویں صدی کی اس آٹھویں دہائی میں جو فیشن مقبول عام ہو رہے ہیں اُن میں اپنے آپ پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگانے کا فیشن بھی شامل ہے۔ بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری لڑکی سے عشق کی پینگیں بڑھانا بھی آج کا فیشن بن گیا ہے۔ سڑک کے چوراہے پر تانبے کی پلیٹ رکھ کر راہ گیروں کا گریبان پکڑنا اور چندہ وصول کرنا بھی فیشن عام بن رہا ہے۔

یہاں تک کہ فیشن زدہ لوگوں نے بھیک مانگنے کو بھی فیشن بنا دیا ہے۔ شہر میں آج کل جس فیشن نے دُھوم مچا دی ہے اور لوگوں کو اپنے دائرہ اثر میں لایا ہے وہ ''ببوں'' کی پرستش ہے۔ اپنے یہاں ''درویش'' حضرات اپنے آپ کو ''بب'' کہلوانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور آج کے اس دور میں ہماری وادی ''ببوں'' کی زد میں آچکی ہے۔ ان ''درویشوں'' یعنی ''ببُوں'' نے شہر کو اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ ہر خاندان کا ایک ''بب'' ہونا لازمی فیشن بن گیا ہے۔ جس قبیلے یا خاندان کا ''بب'' نہیں ہوتا، اسے پسماندہ خیال کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات ایسے خاندان کو ''کافر'' کا لقب بھی عنایت فرماتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آٹھویں دہائی کے یہ ''بب'' پورے ''ڈسکو ماڈل'' ہوتے ہیں۔ گلے میں رنگ بہ رنگی مالاؤں کی بڑی تعداد لٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ کلائیوں میں تانبے کے چمکیلے کڑے پہنے ہوتے ہیں۔ بائیں کلائی میں قیمتی گھڑی ضرور ہوتی ہے۔ ہاتھوں کی کوئی اُنگلی انگوٹھیوں سے خالی نہیں ہوتی۔ بعض ''بب'' جینز پینٹ اور جینز واسکٹ بھی پہنتے ہیں۔ چرس کے رسیا یہ ''بب'' لوگ عام طور خواتین کے جھرمٹ

میں رہنا پسند کرتے ہیں اور چرس کے کش لگا کر ''دم مارو دم مٹ جائے غم'' کے Tune پر رقص بھی کرتے ہیں اِس رقص کو ان کے مداح روحانی کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ کئی ''ببوں'' نے یہاں کے بعض سرمایہ داروں کے گھروں کی عزت میں ''مٹی میں نمک'' بھی دیا ہے۔ کئی ''بب'' مُریدوں کی بیویوں تک کو ''دکھشنا'' سمجھ کر اُڑا کر لے گئے۔ ان ''ببوں'' کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے یہاں ''سب تہ رَب'' کو یکساں بنا دیا ہے اور ''بب'' کا جامہ پہن کر کچھ سرمایہ داروں کو ایسا ''دب'' دیا کہ اُنہیں دن میں ''نب'' پر تارے نظر آئے۔ اب آپ اس بارے میں ''کب '' کیوں اور کہاں اگر نا ہی پوچھیں تو بہتر ہوگا۔!

کوئی بھی فیشن دائمی روپ اختیار نہیں کرتا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ فیشن نئے روپ دھار لیتا ہے اس لئے بعض لوگ فیشن کو ''بہروپ'' بھی کہتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اگلے وقتوں میں مجاہد منزل سے ''رائے شماری'' کا فیشن جاری ہوا تھا اور پھر آہستہ آہستہ یہ فیشن خستہ حالی کا شکار ہو کر رہ گیا اور لیڈروں نے مردم شماری کی طرف دھیان دیا۔ میر واعظ منزل سے ''دو راستے'' کا فیشن عام ہوا اور پھر لیڈروں نے ''رازِ کدل'' چھوڑ کر نگین کا ایک راستہ اپنا لیا۔ ایک جماعت نے ''الحاق عارضی ہے'' کا فیشن عوام میں متعارف کرایا اور پھر ''الحاق اٹوٹ ہے'' کا فیشن قبول کر کے اسمبلی کی سیٹیں حاصل کر لیں۔ کچھ دیر تک ''اٹانومی'' کا فیشن چل نکلا اور یہ بھی اپنی موت آپ مرگیا۔ آج کال سیاست میں جس فیشن نے تہلکہ مچا دیا ہے اور کامیابی کے نئے جھنڈے گاڑ دئے ہیں وہ ''دفعہ ۳۷۰'' ہے۔ اس فیشن کو ریاست میں اولیں ترجیح

حاصل ہے۔

جس فیشن کو لوگ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، وہ جھوٹ اور مکاری ہے۔ سیاسی لیڈروں سے لے کر ماہی گیروں تک اور چوکیداروں سے لے کر نمبرداروں تک کوئی جھوٹ کے فیشن کو اپنے سے جُدا کرنے پر تیار نہیں۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

〈۹〉

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی سزا پائی ہے یاد نہیں

☆

ایک دفعہ ایک سردار جی ایک گردوارے کے باہر کھڑا تھا۔ اسی دوران دوسرا سردار جی گردوارے سے باہر آیا اور سڑک پر کھڑے سردار جی سے کہا: سردار جی! اندر گردوارے میں حلوہ پک رہا ہے تو سردار جی بولے ''مجھے کیا۔؟'' اس پر پہلے والے سردار جی گویا ہوئے: ''لیکن حلوہ تمہارے لئے بھی پک رہا ہے''، تو سڑک والے سردار جی نے کہا: ''تجھے کیا۔؟''

اپنا یہ پیارا پیارا شہر بھی انہی ''مجھے کیا؟'' اور ''تجھے کیا؟'' کی حدوں میں گھر گیا ہے اور اس شہر کے لوگ بھی ''مجھے کیا؟'' اور ''تجھے کیا''؟ کی حدوں میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی سے کہو ''جناب شہر جل رہا ہے'' تو وہ بولے گا ''مجھے کیا؟''۔ اُسے کہو ''حضرت! تمہارا گھر بھی اسی آگ کی نذر ہو رہا ہے'' تو وہ جواب دیگا ''تجھے کیا؟''۔ یہاں کے لیڈر سے کہو ''لوگ مر رہے ہیں۔'' تو وہ کہیگا ''مجھے کیا؟''۔ اُسے پوچھو ''مگر تم تو مزے لوٹ رہے ہو''۔ تو وہ بولے گا ''تجھے کیا؟''۔

جہاں دیکھو اور جدھر دیکھو بس ''مجھے کیا؟'' اور ''تجھے کیا؟'' کی رٹ سُنائی دے رہی ہے۔ بے راہ روی بڑھ رہی ہے، اوباش قسم کے نوجوانوں نے راستے میں لڑکیوں کا چلنا دشوار بنا دیا ہے، رشوت کی وبا عروج پر ہے، جہیز کی بدعت نے لڑکیوں

کی زندگی المناک بنادی ہے۔ بیروزگاری نے نوجوانوں کو اعصابی تناؤ کا شکار بنادیا ہے لیکن کون کیا کررہا ہے؟ کس کو اپنی ذمہ واری کا احساس ہے؟ کون اس صورت حال میں بہتری لانے میں سنجیدہ ہے؟ صرف ''مجھے کیا؟'' اور ''تجھے کیا؟'' کا تماشہ چل رہا ہے۔

جن دنوں فرانس اور جرمنی میں جنگ جاری تھی اور جرمنی فوجوں نے فرانس کے ایک علاقے پر قبضہ کرلیا تھا، جرمن کا ایک سپاہی فرانس کے ایک مقبوضہ علاقے میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اچانک بمبار طیاروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور جرمن فوجی بھاگ کر نزدیک کے ایک مکان میں پناہ لینے کی غرض سے گھس گیا۔ وہاں جرمن فوجی نے ایک عورت کو اکیلا پایا تو دست درازی شروع کردی۔ اسی اثنا میں عورت کی جوان بیٹی وہاں آدھمکی اور اُس نے جرمن فوجی سے گڑگڑا کر کہا۔ ''فوجی صاحب! میری ماں کو چھوڑ دیجئے۔ جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں میرے ساتھ کیجئے۔ میں اپنی ماں کے مقابلے میں خوبصورت بھی ہوں اور جوان بھی۔ میں اپنے آپ کو تمہارے سُپرد کرتی ہوں مگر میری ماں کو چھوڑ دیجئے''۔ اس پر ماں نے اپنی بیٹی کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کردیا اور کہا: ''جرمن فوجی مجھ سے جو کچھ چاہتا ہے کرلینے دو۔ کیا تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے''۔ اپنے شہر میں بظاہر کوئی جنگ تو نہیں ہے مگر المیہ یہ ہے کہ پھر بھی سب کچھ جائز بنادیا گیا ہے۔ میں ایک لڑکی کو جانتا ہوں۔ ایک لڑکا اُسے بے حد پیار کرتا تھا۔ اُس نے اپنی پوری زندگی اس لڑکی کے پیار میں تباہ کردی۔ اپنا کیئریر برباد کیا۔ یہاں تک کہ وہ اس سفاک لڑکی کے پیار میں پاگل ہوگیا۔ اچھے بھلے

کی اُس میں تمیز نہ رہی۔اور جب کسی نے اس سفاک لڑکی سے اس لڑکے کی قابل رحم زندگی کے بارے میں پوچھا تو لڑکی نے ایک زوردار قہقہہ مار کر کہا، اس زمانے میں سب کچھ جائز ہے۔معصوم انسانوں کو روندنا جائز ہے۔خلوص کا جواب سفا کی سے دینا جائز ہے۔زندگیوں سے کھلونوں کی طرح کھیلنا جائز ہے۔رحم پرور لوگوں کا خون چوسنا جائز ہے پیار ے بھرے دلوں کو گھایل کرنا جائز ہے اور اگر نا جائز آج کے دور میں کوئی چیز ہے تو وہ خلوص، پیار، محبت ہے اور ایسی فرسودہ نا جائز روایات کو باقی رکھنا نئے زمانے کی توہین ہے۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

کتے کے ساتھ گفتگو

☆

گوشت نوچ لینے کے بعد میں نے ہڈی کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ پھر میں نے دیکھا کہ کتا اس ہڈی کو بڑے مزے سے چبا رہا تھا۔ میں نے حقارت سے کُتے کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔ ''کتا کہیں کا؟'' میں کھڑکی کے قریب ہی بیٹھ گیا اور نہ جانے کیوں کتے کے ہڈی چبانے کا تماشہ دیکھتا رہا۔ یوں تو مجھے کتوں سے ہمیشہ شدید نفرت رہی ہے اس لئے کتے کو اپنے ہی آنگن میں میری ہی ہڈی چباتے دیکھ کر مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ نفرت سے میری بھنوئیں سکڑ گیئں اور میں بول پڑا ''کُتا''؟۔ کُتے نے پوری طرح ہڈی ہڑپ کر لی تھی اور اب وہ پچھلی ٹانگوں پر بیٹھ کر آگے کی ٹانگے کھڑی کر کے دائیں بائیں اطراف کا جائیزہ لے رہا تھا۔ اُس نے سرسری نظر مجھ پر بھی ڈالی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے بعد یہ آوارہ کتا ٹانگے پسار کر سو گیا۔ مجھے اس جانور کی یہ بے پروائی بالکل پسند نہیں آئی اور میں دوبارہ بول پڑا ''کُتے کی اولاد''!۔ اس بار میری آواز کچھ اونچی ہوگئی تھی۔ دفعتاً کُتا کھڑا ہو گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شُستہ اردو میں یوں گویا ہوا۔ ''بھائی صاحب! آپ بڑی دیر سے میرا نام لے رہے ہیں۔ کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے؟''۔ پہلے مجھے اس بے زبان کی زباں دانی پر حیرت ہوئی لیکن پھر ایک دم خیال آیا کہ اس اُلو کے پٹھے نے مجھے بھائی کہہ کر مخاطب کیا ہے اور میں آگ بگولہ ہو گیا۔ میں چیخ پڑا۔ ''حرام زادے! تیری یہ ہمت کہ تو مجھے بھائی کہے۔ اصل میں تُو سچ مچ کُتا ہے''۔

کُتے نے بڑے ہی اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ ''بھائی نہیں تو کیا بیٹا کہوں

؟۔رہی میری سچ مچ کُتا ہونے کی بات، وہ تو جناب میں ہوں ہی اور آج تک کسی نے بھی مجھے انسان کہہ کر میری توہین نہیں کی ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ ہم کبھی کبھی اپنے ساتھیوں کو انسان ہونے کا طعنہ ضرور دیتے ہیں۔ یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب کسی معاملے پر چھینا جھپٹی کی نوبت آتی ہے''۔

کتے کی یہ باتیں سُن کر میں آپے سے باہر ہو گیا اور میں نے کہا ''چاہوں تو تیری ہڈی پسلی ایک کردوں''۔

کتا میری دھمکی سے بالکل نہیں گھبرایا۔ ''میں تجھے خوب جانتا ہوں۔ تجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ مجھ سے خالی ہاتھ لڑ سکے البتہ مجھے تمہیں کاٹنے میں کوئی قباحت نہیں ہوگی''۔ کتے کی یہ بات سُن کر میں تھوڑا سا سہم گیا اور میں نے بڑے ہی طنز سے کہا۔ ''اگر کُتا انسان کو کاٹ لے تو انسان واپس کُتے کو نہیں کاٹتا''۔ کُتے نے فخریہ انداز میں جواب دیا: تم ایسا کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ ایسا کرنے کے لئے آپ کو پہلے کُتے کے مقام پر پہنچنا ہوگا اور ہمارے لئے انسان کے درجے تک گر جانا کوئی مشکل بات نہیں۔ اب رہا سوال کاٹنے کا، تو کاٹتے تم بھی ہو مگر کتوں کو نہیں کیونکہ تم جانتے ہو کہ اگر کتوں کو دانت بھی دکھا دیئے تو وہ چیر پھاڑ کے رکھ دیں گے۔ تم اپنے ہی نسل کے لوگوں کو کاٹتے ہو، زہریلے آٹے سے، ناجائز منافع خوری سے، ذخیرہ اندوزی سے، جہیز کے مطالبے سے، اور۔۔۔اور۔۔۔۔'' کُتے کی ان باتوں سے میں تھوڑا سا شرمندہ ضرور ہوا مگر میں نے کہا ''تو ایک حقیر مخلوق ہے اور میں اشرف المخلوقات ہوں''۔ کُتے نے ایک زوردار قہقہہ مارا اور میں دانت پیستے رہ گیا۔ سوچا اس کُتے کی اولاد کی کھال اُدھیڑ دوں۔ کُتا کہہ رہا تھا۔ ''اشرف المخلوقات! تم خودفریبی کا شکار ہوا انسان صاحب۔ قلم تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جو جی میں آیا اپنے آپ کو لقب دیدیا۔ مگر کیا اس لقب پر کبھی

تمہیں ہماری حمایت بھی حاصل رہتی ہے؟ تم اپنی کمتری اور بزدلی پر خود ہی القاب کے لبادے اوڑھ رہے ہو۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر اشرف المخلوقات صاحب! یہ تو سوچو کیا تم نے ہمیں کبھی انسانوں کی طرح مٹی کا تیل حاصل کرنے کے لئے لمبی قطاروں میں اپنی زندگی کے بہترین لمحات ضائع کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔؟ کیا تم نے کبھی کسی کُتے کو دوسرے کتوں پر لاٹھی چارج کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پولیس تم لوگوں پر لاٹھیاں برساتی ہے تو کبھی ہمارا کوئی بھائی بھی بے چارا اس کی زد میں آجاتا ہے اور اسے ہم اپنی برادری میں انسان کی ''مہربانی'' کہتے ہیں''۔ کُتے کی ان باتوں نے مجھے بغلیں بجانے پر مجبور کر دیا لیکن اپنی آنچ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے کہا ''تم کچھ بھی کہہ، آخر تم ایک جانور رہو۔ ہماری کچھ نفاستیں اور نزاکتیں ہیں جن سے تم محروم ہو''۔ یہ اُلو کا پٹھا کُتا بھی کہاں چپ رہنے والا تھا۔ فوراً بول پڑا۔ ''یہ صحیح ہے کہ تم نے اپنے مزاج کو نفاستوں اور نزاکتوں کے تابع بنا دیا ہے مگر یہیں پر تمہاری احساس کمتری کی نشاندہی ہوتی ہے۔ غیر فطری نفاستوں اور نزاکتوں نے تمہیں ایک کمزور شے بنا دیا ہے''۔

میں نے غصے میں زور سے کھڑکی بند کر دی مگر پھر اس سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کُتے کی باتوں میں صداقت تھی جو مجھے لاجواب کر گئی؟ یا میرا علم اتنا کمزور ہے کہ کُتے کو دُرست جواب نہ دے سکا۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا!

تیری بندہ پروری سے میرے دن گذر رهے هیں
نہ گلہ هے دوستوں سے نہ شکایتِ زمانہ

☆

مثل مشہور ہے کہ ایک امیر صاحب کا ایک غلام احمق تھا۔ یوں یہ امیر صاحب بھی حماقتوں کے پلندا تھے مگر ان کی ڈگری غلام کے مقابلے میں کچھ حد تک کم تھی، اور درجہ کے اعتبار سے غلام احمقانہ پن کے آخری زینے پر پہنچ گیا تھا۔

ایک دن امیر صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں چل دیئے اور غلام کی حماقتوں کے وسیع تجربے کی روشنی میں اُسے یہ حکم دیا کہ گھوڑے کے پیچھے پیچھے خاموشی سے چلو۔ اُن دنوں کسی امیر صاحب کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے نوکر کا چلنا شان و شوکت اور جاہ وجلال کی علامت گردانا جاتا تھا۔ آج وقت بدل گیا ہے۔ چونکہ آج امیر صاحب گھوڑوں پر سوار نہیں ہوا کرتے کیونکہ جرائم کا گراف بہت بڑھ گیا ہے اور گھوڑے پر سواری سے ٹاپیں کم اور جان کے لالے زیادہ پڑتے ہیں، اس لئے جان کی امان یا سیکورٹی کے سامان کے تحت اب پیچھے بندوقوں والی جیپسی اور آگے پائلٹ والی جیپ ہوا کرتی ہے۔ بہرحال امیر صاحب آگے آگے چلتے رہے اور غلام گھوڑے کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ راستے میں سفر کے دوران ایک جگہ امیر صاحب کی قیمتی رومال گر گئی مگر امیر صاحب اپنی اس ''گراوٹ'' سے بےخبر رہے۔ غلام کی 'فرض شناسی' نے بھی اسے اُٹھانا گوارانہ کیا کیونکہ وہ مالک کے حکم کے مطابق خاموشی سے چلنے کی یہ

تاویل اخذ کر گیا کہ رومال تو کیا اگر مالک بھی گھوڑے سے گر جائے مجھے وہ بھی نہیں اُٹھانا۔

جب امیر صاحب منزل پر پہنچے اور رومال کی ضرورت پڑی تو انہیں رومال نہیں مل رہی، وہ بڑی بے تابی سے اپنی جیبیں کھنگالنے لگے مگر اس 'کریک ڈاؤن' سے کچھ ہاتھ میں نہ آنا تھا نہ آیا۔ غلام کو مالک کی یہ ذہنی افراتفری ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے مالک سے کہا، حضور اگر آپ رومال ڈھونڈ رہے ہیں تو اسکے حوالے سے گذارش خدمت یہ ہے کہ اب آپ اُسے بالکل نہ ڈھونڈیئے گا کیونکہ وہ حضور کی جیب سے نکل کر گھوڑے کی اونچائی سے راستے میں ہی سڑک پر کود گئی۔ خادم نے بہ چشم خود اُس کے فرار کا تماشہ دیکھا ہے۔

امیر صاحب بڑے ناراض ہوئے اور جھنجلا کر غلام سے پوچھا، ''ارے کم بخت، تو نے پھر اسے اُٹھایا کیوں نہیں؟'' غلام نے جواب دیا، حضور خادم کیسے حضرت کے حکم کی عدولی کر کے گستاخانہ رویئے کا مرتکب ہوسکتا تھا، حضرت کا چونکہ یہ حکم تھا کہ خادم خاموشی سے چلے، چنانچہ میں نے رومال کے رفو چکر ہونے کی اطلاع دینے میں یہ خدشہ محسوس کیا کہ اس عمل میں زبان کے ہل جانے کا احتمال ہوگا جو سراسر خاموشی کی خلاف ورزی ہوتی۔

امیر عاجز آئے اور ڈانٹ کر غلام سے کہا، آئندہ جو بھی چیز گھوڑے سے گر جائے اُسے فوراً اُٹھالیا کرو۔

پھر جب امیر صاحب کے دوبارہ گھوڑے پر سواری کی نوبت آئی تو حسب

روایت غلام گھوڑے کے پیچھے ہولیا۔ اس دفعہ امیر صاحب کی جیب سے کوئی رومال تو نہیں گری مگر گھوڑے کو ہی کچھ گرانے کی حاجت پیش آئی۔ گھوڑا چونکہ تکلّفات میں نہیں پڑتا اسلئے لید بھی جہاں جی چاہے وہیں رفع کر دیتا ہے۔ امیر صاحب کے گھوڑے نے بھی چلتے چلتے ہی رفع احتیاج کیا اور غلام نے بھی امیر صاحب کے اس حکم کہ جو چیز گھوڑے سے گر جائے اُٹھالیا کرو، کا لحاظ رکھتے ہوئے تمام گوبر اپنی بڑی رومال میں سمیٹ لیا اور جب امیر صاحب گھوڑے سے اُتر کر دوستوں کی مجلس میں تشریف فرماتھے تو غلام میاں سامنے آئے اور اپنی رومال کھول کر امیر صاحب کے سامنے وہ پوری امانت پیش کی جس کی گھوڑے نے سڑک پر خیانت کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس غلام جیسے امین اور ذہین عُنقا تو نہیں ہوئے بلکہ ہر دور میں موجود پائے گئے ہیں۔ اس معاملے میں ہماری وادی بھی کسی بدنصیبی کا شکار نہیں ہوئی بلکہ ایسے لوگ وقت وقت پر یہاں بھی دریافت کئے جاتے رہے ہیں یہاں تک کہ بعض مولوی صاحبان بھی، چہ جائیکہ حاسد حضرات انہیں خودساختہ ہی کہتے ہوں، اپنے مذاق اور مزاج سے بسا اوقات یہ ثبوت دیتے رہے ہیں کہ وہ اگلے وقت کے مذکورہ غلام کے مداحوں میں سے ہیں۔ ہماری وادی میں پائے جانے والے کئی دانشور حضرات بھی کسی سے کم نہیں ہیں اور وقتاً فوقتاً یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ غلام مذکورہ کے پرستاروں میں سے ہیں۔

کچھ وقت پہلے دارالعلوم بلالیہ میں ایک اجلاس کا انعقاد ہوا، اس میں کئی علماء نے حاضرین سے خطاب کیا جن میں بیرون ریاست کے ایک شعلہ بیان مقرر مولانا زبیر صاحب (دامت برکاتہم) نے بھی بہت خوبصورت تقریر کی۔ شام کی تقریر کے

بعد بہت سے لوگوں کے اصرار کے بعد انہوں نے اگلی صبح کو بھی بیان فرمایا، جسمیں انہوں نے یہ بھی کہا: ''....... ایک مرتبہ جب جلسہ چل رہا تھا عظمتِ قران کے اوپر بات آگئی اور میں نے یہی مسئلہ چھیڑ ڈالا کہ اپنے بچوں کو مدارس کے اندر داخل کرو، اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دو، قرآن کی تعلیم دو، اور جب میں فارغ ہو کے گیا کمرے میں، اور جتنے جلسے والے تھے وہ لگے تھے پنڈال سمیٹنے میں، آنے والے مہمانوں کو رخصت کرنے میں، ہم تن تنہا بیٹھے ہوئے تھے ایک صاحب آئے اور آکر کہنے لگے مولوی صاحب آپ نے اپنی تقریر میں کیا کہا؟ اب میرے پسینے چھوٹ گئے اسلئے کیونکہ میں دل کا بڑا کمزور آدمی ہوں، بھائی بڑی صاف سیدھی بات بتا رہا ہوں آپ حضرات سے، میرے پسینے چھوٹ گئے، میں نے کہا ایک ہٹا کٹا آدمی اور تین چار آدمی اسکے ساتھ ہیں، میں نے کہا نہ جانے کیا بات منہ سے نکل گئی، میں نے سوچا آج تو ہڈی پسلی بچے گی نہیں۔! وہ کہنے لگے مولانا کیا کہا آپ نے؟ میں نے کہا آپ بتائیے کہ کیا کچھ کہا ہے، غلطی ہوئی ہو تو اپنی غلطی کا اقرار کرلونگا، کہا: مولانا تم نے کہا ہے کہ اپنے بچوں کو مدارس کے اندر بھیجے، اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیجئے میں نے کہا، ہاں بھائی یہ بات تو کہی، اشکال کیا ہے؟ کہنے لگے، ''مولانا مدرسوں کے اندر بچوں کا ہوگا کیا؟ اِلّا یہ کہ پیر اور ہاتھ سے اپاہج بن جائینگے!۔ اِلّا یہ کہ مدرسوں میں جا کر رمضان المبارک میں ہاتھ میں رسید بک لئے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے، اِلّا یہ کہ وہ مانگنے پھرنے کا سلسلہ جاری کردینگے، پورے سماج پر بار بن جائینگے، نہ اُن کے کچھ کرنے کا ہاتھ اور پیر کے اندر طاقت رہے گی، اپنی کمائی کے بجائے دوسروں کی جیبوں

پر اُنکا سہارا ہوگا، ارے آپ کو تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اپنے بچوں کو پروفیسر بنائے، ڈاکٹر بنائے، اپنے بچوں کو وکالت پڑھائیے۔'' اے کشمیر کے رہنے والے مسلمانو! زبیر کھلے لفظوں میں تمہارے سامنے کہنا چاہے گا کہ ہم دین و دنیا کی تعلیم کے مخالف نہیں، ہم ڈاکٹر بننے کے مخالف نہیں، ہم تو یہ کہتے ہیں مسلمانو! اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلاؤ۔ ہم تو یہ کہتے ہیں مسلمانو! کہ آپ اپنے بچوں کو ڈاکٹر بھی بناؤ، وکیل بھی بناؤ، بیرسٹر بھی بناؤ، آپ اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری بھی دِلاؤ۔ ارے کشمیر کے مسلمانو! زبیر کی تو یہ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکو اتنی ترقی دے کہ تمہارے بچے ہندوستان ہی میں نہیں باہر کے ممالک میں بھی پڑھیں، ساری دُنیا کی معیشت آپکے ہاتھوں میں آجائے، اقتصادیات کے مالک تم بن جاؤ، طاقت تمہارے ہاتھ میں آجائے، زبیر اس ترقی کا مخالف نہیں، چاہے ترقی کرتے کرتے سورج اور چاند کو پار کر دینا۔ لیکن اس فقیر کی ایک بات یاد رکھ لینا کہ اپنے بچے کو جو چاہیے بنا دینا، مگر سب سے پہلے اُسے ایک مسلمان بنا دینا۔ اس کو یہ بتا دینا کہ تو کسی کا غلام ہے، اسکو قرآن کی تعلیم دیدینا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم دیدینا۔ ہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم دیدینا۔!

سنا ہے کہ ایک نیم مولوی اور ایک نیم دانشور بھی مولانا زبیر کا یہ بیان سن رہے تھے، اور بڑے غور سے سن رہے تھے۔ پھر دونوں نے مولانا کے اس بیان سے جو نتیجہ اخذ کیا وہ کچھ اسطرح تھا۔'' مولانا زبیر کے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ انسان ڈاکٹر بنے تو کوئی حرج نہیں مگر مسلمان ڈاکٹر بنے۔ انسان وکیل بنے تو کوئی اعتراض نہیں مگر

مسلمان وکیل بنے۔ انسان پروفیسر بنے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر مسلمان پروفیسر بنے۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر پھر مولانا کی تقریر کی آڑ میں وہ سب چیزوں کی حلال بناتے گئے۔

نیم دانشور: مولانا کا یہ بھی مطلب تھا کہ اسلام میں ہر چیز کی گنجائش موجود ہے مگر شرط یہ ہے کہ کام مسلمان ہو کے کئے جائیں۔

نیم مولوی: آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔

نیم دانشور: یعنی رشوت کھائے مگر مسلمان راشی بنے۔ فیشن پر کوئی رکاوٹ نہیں مگر مسلمان بے حیا بنے۔ جعلسازی تب گناہ نہیں رہتی جب مسلمان جعلساز بنے۔

پھر نیم مولوی نے کہا، آپ اپنا بھی خیال رکھئے گا۔

اور نیم دانشور نے بھی کہا کہ آپ بھی اپنا خیال رکھئے گا۔!

میں آپ سب کو کہتا ہوں کہ آپ بھی اپنا خیال رکھئے گا۔

دانشوروں کا تصوف۔۔۔!!

☆

ہمارے ایک دانشور دوست ہیں، ادیب بھی ہیں اور ایک سرکاری عہدے پر فائز بھی ہیں۔ میری بدنصیبی کے سبب انہیں تصوف کا کوئی بے نام بھوت بُری طرح سر پر سوار ہوا۔ نہ جانے کیوں اس بھوت کو بھی سواری کے لئے بس یہی ایک سر پسند آ گیا تھا۔!

یہ دوست مجھے جب بھی ملتا تھا تو صرف تصوف پر بحث چھیڑ دیتا تھا اور بعض اوقات یہ مناظرہ اتنا طول کھینچ لیتا تھا کہ مجھے علم و دانش سے ہی کراہت محسوس ہونے لگتی تھی۔

بحثوں میں الجھنے کا یوں تو کوئی شوق نہیں ہے مجھے، کون چاہیئے گا کہ دوسرے سے خوامخواہ اپنا دماغ چٹوالے۔ یہاں مجھے بس اتنی دلچسپی تھی کہ اگر میں خود اپنے آپ کو سدھار نہ سکا تو کم از کم ایک ادیب کو سدھار کے ہی چھوڑوں گا۔

میں نے تصوف کے موضوع پر کئی کتابیں کھنگال ڈالیں اور الف لیلیٰ کے اُس شہزادے کی طرح لنگر لنگوٹے کس لئے جو جوئے شیر لانے کیلئے نکلا تھا۔ میں پوری تیاری کے ساتھ اس ادیب نما احمق دوست کے پاس محض یہ سمجھانے گیا کہ بھائی تصوف کی اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان شریعت کے راستے پر مضبوطی سے جم جائے، باقی جو کچھ بھی ہے وہ محض حاتم طائی کے سات سوالوں کی طرح افراسیابی ہے۔

اس ادیب دوست کے پاس پہنچ کر جب میں نے پورے اسناد کے ساتھ

تصوف کی تعریف شروع کردی اور اس کی حقیقت کا تعلق شریعت پر عمل پیرائی سے جوڑ دیا تو اس دوست سے رہا نہ گیا۔ اُس نے اشاروں اور کنایوں میں جو بات مجھے سمجھانے کی کوشش کی وہ یہ تھی کہ ہمارے یہاں کے کئی دانشور حضرات ایک خاص قسم کے تصوف کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہ تصوف کیسا ہے؟ میری زبان میں اس کی تشریح اس طرح ہے:

ایسا تصوف جس میں کام تو بالکل نہ کرنا پڑے مگر آرام وآسائش بے انتہا ہو۔ مثلاً ایسی درویشی کہ گھر پر مریدوں کا تانتا بندھا ہے، کوئی ٹانگیں دبائے، کوئی سر سہلائے، کوئی ہدیہ لائے، کوئی گانا گائیے، کوئی وازوادن کھلائے، کوئی پنکھا جھلائے، کوئی بستر بچھائے، کوئی تکیہ لگائے، غرض مرید ہی پلائے اور مرید ہی سُلائے..... پھر اسی پر بس نہ ہو بلکہ مریدوں میں خواتین کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود ہو اور درویش صاحب کو اُن کے ساتھ گل مل جانے میں کسی قاعدے قانون کی بندش بھی نہ ہو۔ درویش صاحب کو کچھ ایسا تصرف حاصل ہو کہ جسے چاہئے مصیبت میں گرفتار کرادے اور جسے چاہیے دولت والا بنا دے۔ خود نہ کبھی بیمار ہو اور نہ کبھی کسی غم سے واسطہ پڑ جائے۔

میں نے جب دانشور دوست کے تصوف کی غرض و غایت سنی تو ادیبانہ بلاغت میں اپنے غصے کو پناہ دیتے ہوئے اس ادیب نما احمق سے کہا: ''میرے بھائی اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ ورنہ اسی تصوف کے شوق اور تلاش میں رہے اور اس دوران موت نے آدبوچا تو تم دیکھو گے کہ تمہارے سامنے مریدوں کی فوج نہیں بلکہ

عقارِب کے قافلوں کے قافلے ہوں گے جو تمہارے نتھنوں کے شامیانوں میں ہمیشہ کیلئے رہن سہن اختیار کریں گے۔ تمہارے سامنے سر سہلانے والا کوئی مرید نہیں ہوگا بلکہ اژدھاؤں کے جتھے ہوں گے جو تمہارے سر پر سہرا بندھی کریں گے اور اُن کے بھیانک سروں کی لڑیاں تمہارے چہرے کو چھپائیں گی۔ تمہارے کانوں میں کسی مرید کے گانوں کی آواز نہیں آئے گی بلکہ تمہاری کپیاؤں سے اَژدروں کے جھمکے لٹکیں گے۔ تم دیکھو گے کہ تمہاری ٹائی کے گانٹھ کی جگہ تمہارے حلق پر کوئی ظالم کچھوا چپک گیا ہوگا اس لئے چیخ بھی نہیں پاؤ گے۔ جن ٹانگوں کو تمہیں مریدوں سے دبوانے کی آرزو دِل میں پنپ رہی ہے، انہیں عفاریت اپنے لمبے، تیز اور نوکیلے دانتوں سے چبانے لگیں گے۔

دراصل یہاں کے دانشور ایک ایسے تصوف کی دریافت میں لگے ہیں جن سے اُن کے مفادات کی آبیاری ہوتی ہے۔ ایسا تصوف جس میں تمام مذاہب کو یکساں درجہ حاصل ہو۔ ایسا تجربہ پہلے بھی ہوا تھا جو برصغیر میں تو مکمل ناکام ہوا لیکن ہالینڈ وغیرہ کے چند ممالک میں کچھ لوگ اس مسلک کے حامی اور پیروکار بنے مگر بعد میں وہاں بھی اس تحریک نے پوری طرح دم توڑ دیا۔ یہ چند لوگوں نے تھیوسوفیکل سوسائٹی بنانے کی تحریک شروع کی تھی۔ اس تحریک کے متعلق جو کچھ میں نے پڑھا ہے وہ کچھ اس طرح ہے: ''سب مذاہب یکساں درجہ رکھتے ہیں، کسی ایک مذہب کو دوسرے پر فوقیت نہیں۔ اس مسلک میں کتاب فطرت انسان کا واحد مقدس صحیفہ ہے اور عالمگیر اخوت انسان کا واحد مشترکہ مذہب ہے۔ عبادت کو بین الاقوامی اتحاد کا ذریعہ بھی سمجھتے

ہیں اوراس مقصد کیلئے اس تحریک میں "عالمگیر عبادت" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔
"عالمگیر عبادت" میں حصہ لینے والے ایک بند کمرے میں قطار در قطار بیٹھ جاتے ہیں۔ سامنے ایک کشادہ میز کے عین وسط میں ایک بڑی موم بتی روشن کی جاتی ہے جو علامتی طور پر خدائے واحد کی نشانی ہوتی ہے جو ساری روشنی اور علم کا منبع و ماوٰی ہے۔
اس موم بتی سے نیچے کی سطح پر چھ چھوٹی موم بتیوں کی قطار ہوتی ہے۔ جو علی الترتیب ہندومت، بدھ مت، زرتشیت، یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں ہر موم بتی کے سامنے اس مذہب کا صحیفہ بھی رکھا جاتا ہے۔ "عالمگیر عبادت" کے اس مجمع کو "Church for all" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

ابھی حال ہی میں ایک امریکی نے اسی طرز کی ایک تحریک کی شروعات کی تھیں اور ہندوستان میں اس کا تجربہ شروع کیا تھا مگر ناکام ہوا۔ اسلام کا انداز نرالا ہے......... یہ موم بتیوں کا مذہب نہیں ہے..... اور نہ ہی اس میں خرافات کی گنجائش ہے۔ اس میں طفلانہ حرکتوں کو پسند نہیں کیا جاتا کہ موم بتیوں کی روشنی میں خدا تلاش کیا جائے۔ اس مذہب میں عمل خیر پر زور دیا جاتا ہے۔

اسلام تمام انسانوں، چاہے وہ کسی رنگ، نسل اور عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں، کو ایک اُمت مانتا ہے۔ پھر اس امت کو دو ذیلی امتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک امت اجابہ اور دوسری اُمت دعوۃ۔ امت اجابہ وہ ہے جس کے اعمال اللہ کے حضور میں مقبول ہوں اور باقی جو لوگ ہیں وہ امت دعوۃ کہلاتے ہیں۔ امت اجابہ پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اُمت دعوۃ کو حق کی طرف دعوت دیں اور اس کیلئے اُمت اجابہ

پر یہ لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ تبلیغ کے اس کام میں تدبّر، نرمی، پیار و محبت، احسان، درد مندی اور بہتر سے بہتر طریقے اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''بُلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سُنا کر بھلی طرح''

(۱۶:۱۲۵)

بہرحال اپنا خیال رکھئے گا۔۔۔!

اردو زبان

☆

اُردو زبان پہلے ہی بے چاری مر رہی ہے۔ پوری دُنیا میں اس کی کہیں سر زمین ہی نہیں ہے، اب جو وادی کے دَورے پر آئی تو یہاں بھی بعض لوگ اس کے پیچھے کچھ اس طرح پڑ گئے ہیں کہ سخت جان نہ ہوتی تو کب کا جنازہ اُٹھ گیا ہوتا۔! یہاں اس کی حالت اُس پیر فرتوت جیسی ہوگئی ہے جس کی کمر خمیدہ ہو چکی ہو۔ یہ زبان ایسی شہزادی تھی جس کی پوشاک حریرو دیبا تھی مگر یہاں اس کو ایسا پھیچڑ بنایا گیا ہے جس کی حالت کذائی پر گداگروں کے دیدے بھی اُبل پڑیں۔! پہلے یہاں اس زبان کے اسماء کی عزّت لُٹ گئی پھر گرائمر سے بھی بے آبرو ہوگئی۔

گذشتہ دنوں کشمیری نژاد اُردو بچے نے اپنی اُردو دیوانی ماں سے کہا:

بیٹا: ماں ماں! مجھے روپے دیدو۔

ماں: کس لئے؟

بیٹا: میں 'قرمُوٹھ' لاؤں گا

ماں: نہیں۔ 'قرمُوٹھ' سے 'پیچ' آتے ہیں، اچھا لڑکا 'قرمُوٹھ' نہیں کھاتا، یہ تھرڈ کلاس لڑکا مارتا ہے

بیٹا: پھر میں 'ٹنگ' کھاؤں گا۔

ماں: کیا ہو گیا، اُردو نہیں آتا۔ گندا لڑکا۔ ٹنگ نہیں کہتے۔ ناشپاتی بتانا۔

بیٹا: ماں ماں۔ اُس کا وہ 'نل' کیوں ہوتا ہے؟

ماں: فضول ہوتا ہے (بیٹے کو ایک روپے دیتے ہوئے)

آپ کچھ 'بَدَل' کھاؤ

بیٹا: پھر میں 'ڈون' ماروں؟

ماں: کیا ہو گیا، اُردو زبان غلط وَلط بولتا ہے، ڈون نہیں اخروٹ کہتے ہیں۔ آپ کچھ بَدل مارو۔ اخروٹ میں 'کُنڈ' ہوتا ہے۔ دانت، کنڈی سے خراب ہوتا ہے۔

بیٹا: پھر ماں میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ روپے کو 'بُغلہ واری' میں ڈالوں گا۔ 'سُونبراؤں' گا۔ پھر جب میں دوسرے کلاس میں چڑھوں گا۔ اُس وقت 'پھٹہ راؤں' گا۔ اور کیرن بورڈ لاؤں گا۔

ماں: جاؤ۔ اب سکول کا کام کرو ورنہ ڈیڈی 'مسلہ والے گا'

چنانچہ اپنے 'مسلہ' کا خیال رکھنے کیلئے بچہ ہوم ورک میں لگ گیا۔ خود کا کوئی خیال نہیں رہا۔

بہر حال آپ اپنا خیال رکھئے گا۔!

محبت کی جاتی ھے ۔۔۔۔۔!

☆

میرے بزرگو، دوستو، بہنو اور بھائیو۔!

اخبار کے اس کالم کی وساطت سے اکثر و بیشتر آپ تک رسائی ملتی ہے، اور کوشش یہ کرتا ہوں کہ خود اُداس ہی سہی مگر شاید آپ مسکرا سکیں۔ اگر میرے نزدیک میری ذات کے تعلق سے کوئی بات سچ اور قابل اعتبار ہے تو وہ یہ کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو کسی کام کا نہیں۔ یہ محض بزرگوں کی بزرگی، عظمت و کشادہ دلی اور رحم پروری ہے کہ مجھ جیسے ناکارہ آدمی کی طرف کبھی کبھی اُن کا التفات ہوتا ہے، جس کی برکت سے احقر میں توانائی آتی ہے اور میں اُسی التفات کی تاثیر سے اپنا قلم کاغذ پر 'گھسیٹ' لیتا ہوں۔ مرزا غالبؔ نے کہا ہے:

عشق نے نکما کردیا غالبؔ
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں شاعر ہوتا تو یوں کہتا:

عشق نے تو انا کردیا غالبؔ
ورنہ ہم تو آدمی تھے نام کے

غالبؔ نے کہا ہے:

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

میں شاعر ہوتا تو یوں کہتا:

کعبہ جس منہ سے بھی جاؤ گے غالبؔ
پاؤ گے رحمت حق ہر طرف آتی

غالبؔ نے کہا ہے:

عشق پر زور نہیں یہ وہ آتش ہے غالبؔ
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

میں شاعر ہوتا تو یوں کہتا:

عشق پر زور صحیح یہ وہ آتش ہے غالبؔ
جو لگائے تو لگے اور بجھائے نہ بجھے

یہاں ایک بات یاد آ گئی، ملفوظات حکیم الامتؒ میں لکھا ہے کہ ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ محبت کرنے کا بہت ہی سہل طریقہ ہے، میں نے ایک اُمی بزرگ سے بھی پوچھا تھا کہ خدا سے محبت کس طرح پیدا ہو۔ فرمایا کہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی کو آپس میں ملا کر رگڑو، میں نے ایسا ہی کیا، دریافت فرمایا کہ کچھ گرمی معلوم ہوئی، میں نے عرض کیا کہ جی ہاں، گرمی معلوم ہوئی۔ فرمایا بس یہی طریقہ ہے محبت پیدا کرنے کا۔ کثرت سے اللہ اللہ کر کے قلب کو رگڑا کرو محبت پیدا ہو جائے گی۔

بزرگوں کی باتوں پر عمل کیجئے گا اور میری اس بات کا بھی خیال رکھئے گا کہ اپنا خیال رکھئے گا۔

میری وادی میرے لوگ

☆

ایک پبلک سیکٹر ادارہ ہے، اس میں مختلف خیالات کے لوگ کام کرتے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کام کرتا ہے۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کام نہیں کرتا۔ میرے لئے دونوں قابل برداشت ہیں۔ مگر ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو نہ کام کرتا ہے اور نہ دوسروں کو کرنے دیتا ہے۔ اس طبقے نے ادارے میں شدید دشواریاں اور مشکلات پیدا کردی ہیں۔ تاہم اس طبقے کے جیالوں میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ چاپلوس میخانے کی شراب چرب زبانی سے اپنے افسروں کو ایسا مخمور کراتے رہے ہیں کہ ''عرب اینڈ کیمل'' (Arab and Camal) والے قصے کی طرح عرب والے افسر باہر ہوتے گئے اور تیجے والے اونٹ خیمے میں جگہ سنھبالتے رہے۔ چناچہ اب اس ادارے کا انتظامیہ ہی اُن ستونوں پر کھڑا ہے جن کے پائے کسی کو نظر نہیں آتے۔ اس موضوع پر زیب داستان کے لئے اتنی بیان آرائی شاید خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ یہ دانائے عصر کام کرنے والے شخص کے پیچھے یوں لگ جاتے ہیں جیسے مکھیاں گُڑ سے چپک جاتی ہیں۔ پھر کام کا شوقین اپنے شوق سے سو بار توبہ کر کے اُسی میخانے میں عزت و آبرو کا مقام تلاش کرتا ہے جس کا ذکر آگے آیا ہے۔

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

میں جانتا ہوں کہ پتھریلی زمین پر میرے قلم کی روشنائی کا شبنم کوئی اثر نہیں

کرے گا مگر بقول شاعر:

سفینہ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزاروں موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

ایک صاحب قلم نے ایک بار کہا تھا کہ کشمیری پنڈت کی شان یہ ہے کہ اُسے کسی دفتر کی ادنیٰ اسامی پر تعینات کر دیا جائے تو وہ دیمک کی طرح سارے عملے کو اندر ہی اندر چاٹ کر اوپر والی کُرسی پر سر نکالتا ہے۔ مگر میں جس ادارے کی بات کر رہا ہوں وہاں معاملہ کچھ دوسرا ہے۔ اوپر والی کرسیوں پر ایسے سر ظاہر ہوئے ہیں جو کشمیری پنڈتوں کے تو نہیں ہیں بلکہ اُن لوگوں کے ہیں جن کے احاطہ فکر میں کام کے تقدس نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس کالم کو لکھتے ہوئے میرے پردۂ خیال پر کچھ ایسے لوگوں کی تصویریں بھی اُبھر رہی ہیں جنہوں نے دین اسلام کی تبلیغ کے معاملے میں ایسا ہی مذاق پایا ہے۔ یہ لوگ اپنے زہریلے خیالات کو علم و دانش کا رنگ دے کر متعفن قے کی طرح بے وقار جلسوں میں انڈیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ذات کے سوا کسی اور کی نمائندگی نہیں کرتے۔ میں ان لوگوں کو خوب جانتا ہوں۔

پاکستان کے ایک سابق صدر نے ایک روز کہا تھا کہ معمولی سی معمولی ڈسپنسری میں مرہم پٹی کرنے اور ٹیکا لگانے کیلئے جو کمپاؤنڈر رکھے جاتے ہیں انہیں اس

کام کی پہلے سے باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے لیکن قوم کے ذہن میں صبح وشام ٹیکا لگانے کیلئے جو لوگ صحافت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں ان کے لئے کسی قسم کی ٹریننگ حاصل کرنا بالکل لازمی نہیں۔

اس سے زیادہ خطرناک وہ لوگ ہیں جو بغیر کوئی تربیت پائے خوامخواہ کے جلسوں میں اسلام کے حوالے سے بے سرو پا کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور اپنے حرام کاموں کو اسلامی جواز سے ڈھانکنے کی بے ہودہ کوشش کرتے ہیں۔

بہرحال حدیث میں آیا ہے: ''اِنَّ اللّٰہ لیغرسُ لِھٰذَ االدّین غرساً'' اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت کیلئے پودے لگاتا رہے گا۔

آپ بھی اپنا خیال رکھئے گا........!

〈۱۶〉

کومنٹری

☆

بعض بزرگوں کا اصرار رہا کہ میں مزاحیہ کالم ''اپنا خیال رکھئے گا۔!'' لکھنے کے سلسلے کو دوبارہ شروع کروں۔ اس نالائق کی کیا مجال تھی کہ انکار کر سکے، مگر مصیبت بس اتنی تھی کہ مزاج لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ لکھنے والے کا مزاج اس کے لئے موافق بنے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب قلم پکڑنے والے کے دِل پر ''بشاشت'' کی ''تشریف آوری'' ہو۔ مگر آج کے وقت ''بشاشت صاحبہ'' گدھے کے سر پر سینگ کے مصداق بن گئی ہے۔

اب دیکھئے! میں بس میں چڑھتا ہوں تو پوری بس کو عطر کی خوشبو میں سوار دیکھتا ہوں، غور کرتا ہوں کہ یا خدا۔! یہ خوشبو کے ایسے تیز تیز جھونکے کہاں سے آتے ہیں۔!؟ بس میں عطر کی کوئی فیکٹری تو ہے نہیں، پھر یہ خوشبو کا ''آنا جانا'' کیسے؟۔ غور کرتا ہوں تو یہ پاتا ہوں کہ بس میں سوار ''جوان بوڑھیوں'' کے ساتھ ساتھ ''بوڑھی دوشیزاؤں'' نے عطر محض لگائی نہیں ہے بلکہ ماشاء اللہ اس سے پورا غسل کیا ہے۔ اب آگے کی طرف سے خوشبو اپنی مستی میں لیتی ہے مگر ساتھ ہی کہیں سے جھلنے کا احساس بھی ہوتا ہے۔ میں غور کرتا ہوں کہ آخر یہ اتنی گرمی کہاں سے آ رہی ہے بھائی۔!؟ تو یہ پاتا ہوں کہ پیچھے سے دوزخ کے شعلے لپک رہے ہیں۔ میں شدید تذبذب میں پھنس جاتا ہوں۔ ایک طرف خوشبو لپٹ رہی ہے اور دوسری جانب اس کی سزا میں تصور کی آنکھوں سے دوزخ کے شعلوں کا مشاہدہ ہے۔ جاؤں تو کدھر جاؤں۔ چانچہ میں بس

سے نیچے اُترتا ہوں۔

اب یہاں دوسری مصیبت ہے۔ بس کی سواری سے جو مصیبت سر پر چڑھ گئی تھی اُس سے نجات تو پالی مگر اب دوسری مصیبت زبردستی سے استقبال پر اُتر آئی ہے۔ یہاں جب سورج کی روشنی ''من جملہ'' عورتوں کے باریک لباس سے گزرتی ہے تو لگتا ہے جہنم میں کوئی اپنی آنکھیں داغ رہا ہے۔ یقین کیجئے ایک بار میں نے ایک لڑکی کے جسم سے نگاہیں ہٹا کر پھر دوسری بار اُسے دیکھنے کی حماقت کی کیونکہ مجھے اپنی آنکھوں پر یہ اعتبار نہیں آیا تھا کہ جو کچھ مجھے پہلی نظر میں آیا کیا وہ حقیقت تھی یا کہ محض دھوکا....!

بہرحال میں ''پیدل چلنے کے گناہوں'' سے بچنے کی خاطر ایک آٹو کرائے پر لیتا ہوں اور منزل پر پہنچنے کے لئے اسی میں چڑھتا ہوں۔

بہرحال اپنا خیال رکھئے گا!

〈۱۷〉

میری آوار گی........!

☆

بعض اوقات میں سڑکوں پر گھومتا رہتا ہوں! یوں ہی بے مقصد۔آوارہ!۔ لوگوں کو دیکھتا ہوا، دِلوں میں جھانکتا ہوا!!۔ دماغوں میں گھستا ہوا!! گناہوں کو ٹٹولتا ہوا!۔ چہروں کو پڑھتا ہوا! آنکھوں کو سنتا ہوا!۔ یونہی گھومتا رہتا ہوں!۔ بے مقصد! آوارہ!۔ بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں۔ دوڑتی ہوئی کاریں، چیختے ہوئے لوگ۔ بھکاریوں کی صدائیں۔ نیم عریاں لڑکیوں کا مارچ۔ اُوباش قسم کے جوانوں کی ہڑ بونگ۔فقرے بازی۔کھوکھلے قہقہے۔ بے ربط سسکیاں۔ میں سب کچھ دیکھتا ہوں۔ کیونکہ میں گھومتا رہتا ہوں۔سڑکوں پر۔یونہی! بے مقصد! آوارہ!۔

ہر شخص میرا تجربہ بن جاتا ہے اور میرا یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ جو انسان اسلام سے دور ہوتا ہے وہ محض ایک متعفن میت بن جاتا ہے۔ ہر لمحہ میرا ثبوت بن جاتا ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ صرف اسلام ہے جو راہِ نجات ہے۔ ہر قدم پر میرا یہ عزم بن جاتا ہے کہ میں اپنے فیصلوں کو اسلام ہی بنیاد بنادوں گا۔میرا امتحان بن جاتا ہے کہ میں اسلام کو کتنا سمجھ رہا ہوں۔ ہر ذرّہ میرا گواہ بن جاتا ہے جو میرے اعمال میں اخلاص کو دیکھ رہا ہے۔

میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔میری نظر ایک دکاندار پر پڑتی ہے۔اُس کا چہرہ سپاٹ ہے۔ بے رونق، ہڈیوں کے ڈھانچوں پر خستہ حال پوست چپکی ہوئی۔اچانک اس پھسپھسائے چہرے میں حرکت آتی ہے اور یہی بے رونق چہرہ ایک کریہہ صورت

دھار لیتا ہے۔ آنکھوں میں شیطانی چمک ظاہر ہوتی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور اندر دھنس جاتے ہیں۔ ہونٹ کچھ اس طرح سکڑ جاتے ہیں جیسے گھبراہٹ میں کُتے کی دُم ٹانگوں سے چپک جاتی ہے۔ اس نئی اُبھرتی ہوئی بدنما اور کریہہ صورت کو دیکھتے ہی میں جھرجھری سی لیتا ہوں اور دکاندار کے چہرے کے یہ تاثرات ہی مجھے بتا دیتے ہیں کہ اس کی دکان سے کوئی عورت گزر رہی ہے۔ میں ایسے تجربات کا عادی ہو چکا ہوں۔ چہروں کے پردۂ پوست پر غلیظ اور گندی کیفیات کی یہ کہانیاں میں نے بہت سے آٹو ڈرائیوروں، دکانداروں، کاروں میں سوار سرمایہ داروں، راہ چلتے مسافروں پر اُس وقت بار بار اُبھرتی ہوئی دیکھی ہیں جب اُن کی متلاشی آنکھوں سے کوئی عورت گزرتی ہے۔ مجھے ایسا اب تجربہ ہو چکا ہے بہت سے انسانوں کے چہروں کو دیکھنے سے ہی مجھے معلوم پڑتا ہے کہ راستے میں کون چل رہا ہے....!

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا۔!

〈۱۸〉

ٹیکس مہم کے بعد

☆

ریاست جموں وکشمیر پورے برصغیر میں وہ انوکھی جگہ ہے جہاں نرالی مہمیں اس زرو وشور سے جاری رہتی ہیں کہ تاریخ دانوں نے اب اسے ''مہمستان'' کا نام دیا ہے۔ حال ہی میں حالات ''معمول'' پر آنے کے انعام میں سرکاری مہم بازوں نے کشمیریوں پر ٹیکس مہم شروع کر دی۔ حالات ''معمول'' پر آنے کی خوشی اتنی زوردار تھی کہ سرکار نے بے قابو ہو کر ''جشن ٹیکس'' منانے کا اعلان کر دیا اور واٹر ٹیکس سے لے کہ بجلی ٹیکس تک وہ مہم چلائی کہ گھبراہٹ میں نلوں سے پانی چلا گیا اور تاروں سے بجلی رخصت ہو گئی۔ سرکاری آدمیوں نے ٹیکس کے نام پر رام نام کی لوٹ مچائی تو غیر سرکاری آدمیوں نے سوچا چلو ہم بھی گنگا میں ہاتھ دھولیں گے اور انہوں نے ٹیکس کے قافیہ پر سیکس کی مہم چلائی۔ چنانچہ آج کل اخباروں میں جو اشتہار چھپتے ہیں اُنہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ فقرے کسے جا رہے ہوں۔ مثلاً:

''خوشخبری خوشخبری نامردوں کے لئے۔ نامردوں کے نامرد مشہور زمانہ نامرد 'ڈاکٹر تھپل' نامردوں کے لئے اُمید کا چراغ لے کر آپ کے شہر میں آئے ہیں، بوڑھوں کے لئے شباب کا پیغام لے کر آئے ہیں، نوجوانوں کے لئے روحِ حیات لے کر آئے ہیں، کمزوروں لے لئے بہارِ جاوداں لے کر آئے ہیں، ضعیف اور نامردی کا خصوصی علاج لے کر آئے ہیں، اولاد قسمت میں نہ بھی لکھا ہو مگر 'تھپل صاحب' نامہ قسمت میں کتابت کرنے آئے ہیں۔ آئے آئے اور موقع کا فائدہ اُٹھایئے۔ فیس۔

شاہانہ علاج دس ہزار روپے، مُفلسانہ علاج پانچ سو روپے، مغل اعظم کا علاج ایک ہزار روپے، انارکلی کا علاج ایک سو روپے، رُستم سہراب کا علاج ایک ہزار روپے۔ نچلی ذاتوں کے لئے بیس فیصدی فیس زیادہ ہوگی، جس کی کچھ خصوصی وجوہات ہیں۔"

اُدھر کچھ روز پہلے جب پولیس نے دیکھا کہ "سیکس سپیشلسٹوں" کی تعداد میں تشویشناک اضافہ ہو رہا ہے تو اُس نے "نامور" قسم کے چھ "ماہرین" کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ جموں پولیس کو شُبہ ہے کہ یہ "طبیبانِ خاص" سیکس علاج کے پس پردہ جسم فروشی کا دھند چلاتے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق ان "طبیبوں" نے انکشاف کیا ہے کہ وہ اعلیٰ سرکاری افسروں سے کافی مال بٹور چکے ہیں جو دفتروں کے بجائے زیادہ تر انہی "جنسی سپیشلسٹوں" کے کلنکوں میں وقت گذارتے تھے اور رشوت کے مال کو اپنا جنسی ضعف دور کرنے پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ سرکاری افسروں کی بھاری تعداد رشوت کی سزا کا ایک حصہ اس دنیا میں ہی کاٹ رہی ہے اور جنسی ضعف میں بُری طرح مبتلا ہوگئی ہے۔ اس راوی کے مطابق کئی اصحاب اقتدار اور سیاسی لیڈر بھی اس کشتی میں سوار ہیں۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا۔!

ملفوظ

☆

میری خیال آرائی سے بہت بہتر یہ ہے کہ آج حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے ملفوظ کا نقل کیا جائے۔ بزرگوں کی باتوں میں نورانیت ہوتی ہے، مجھ جیسے نالائقوں کی باتیں محض الفاظ کا انبار ہوتا ہے۔

''ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ فہم کا آجکل اس قدر قحط ہو گیا ہے شاید ہی الاماشاء اللہ کوئی اس نعمت سے بہرور ہو ورنہ بڑے بڑے لکھے پڑھے اور تعلیم یافتہ اس سے کورے ہیں۔ جتنی حرکات ہیں سب بدفہمی کی۔ یہ لوگ دین کو تو کیا سمجھتے دُنیا کی بھی سمجھ نہیں۔ ویسے خطابات بڑے بڑے۔ کوئی عقلاء کہلاتے ہیں، کوئی ریفارمر، کوئی لیڈر۔ لفافہ پر پتہ تو بڑے جلی قلم سے لکھا ہوا ہے مگر جب کھول کر دیکھو تو معقول مضمون ندارد۔ ان کی بیہودگیوں اور کم عقلی کی باتوں نے مسلمانوں کو تباہ اور برباد کیا۔ ملک میں ہر روز ایک ڈھونگ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں مگر دین کے پکے دُشمن ہیں، دوستی کے پردے میں دُشمنی کر رہے ہیں۔ احکام اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ حرمت سود کا مسئلہ مانع ترقی ہے، کوئی کہتا ہے کہ پردہ مسلمانوں کی ترقی کو مانع ہے، کوئی کہتا ہے کہ صرف توحید خداوندی کی ضرورت ہے اعتقادِ رسالت مانع ترقی ہے۔ غرض کہ ہاتھ دھو کر اسلام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور پھر مسلمان کے مسلمان۔ قوم کے خیر خواہ، راہبر، مقتدا بنے ہوئے ہیں، خیر لگا لیں زور ایڑی سے چوٹی تک، انشاء اللہ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انشاء اللہ وہ اپنی جگہ پر ہے اور اس کے احکام اور تعلیم کی

خوبیاں تو غیر مسلم اقوام کے بڑے بڑے حکما اور فلاسفروں کو تعلیم ہے۔ واقعی حق تعالیٰ ہی اپنے دین کے محافظ ہیں ورنہ اس سے پہلے بھی لوگ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں اپنی تمام قوتیں صَرف کر گئے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ ارشاد فرماتے ہیں: ''ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اُس کے محافظ اور نگہبان ہیں'' اور فرماتے ہیں: ''یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور یعنی دین اسلام کو اپنے منہ سے پھونک مار کر بجا دیں حالانکہ اللہ اپنے نور کو کمال تک پہونچا کر رہے گا گو کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں''۔ اسی کو فرماتے ہیں:

چراغِ راکہ ایزد برفروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد
اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغ مقبلان ہر گز نہ میرد

''یعنی جس چراغ کو اللہ تعالیٰ نے روشن کیا ہو اس کا گل کرنے کیلئے جو پھونک مارے گا اُن کی داڑھی جل جاوے گی۔ اگر ساری زمین میں آندھیاں آجاویں تو بھی اہل اللہ کا چراغ گل نہیں ہوسکتا۔ اور اسلام کی تو وہ شان ہے جس کو فرماتے ہیں:

ہنوز آں ابر رحمت زرفشاں ست خم و خمخانہ با مہر و نشاں ست

یعنی آج بھی وہ ابر رحمت موتی برسا رہا ہے اور خم اور خمخانہ سب سر بمہر موجود ہے۔

اگر اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی محافظت نہ ہوتی اور اسکی حمایت کیلئے حق تعالیٰ وہ جماعت پیدا نہ فرماتے جس کی خبر مخبرِ صادق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں، ''لا یزال طائفۃ من امّی منصورین علی الحق لا یضرھم من خذلھم''، یعنی میری امت میں ایک گروہ

ہمیشہ ایسا رہے گا جو حق پر ہوگا اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی امداد ہوتی رہے گی، کسی کی مخالفت اُس کو ضرر نہ پہنچا دے گی''

تو آج کل کے ریفارمر اور عقلاء کی سازش اور شر کچھ کم نہ تھا۔ فرماتے ہیں کہ ''وان کان مکرھم لزول منہ الجبال'' واقعی اُن کی تدبیریں ایسی تھیں کہ اُن سے پہاڑ بھی ٹل جاویں''

ان سازشوں کو دیکھ کر اسلام بزبان حال کہتا ہے:

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود　　　ورنہ ہیچ از دِل بے رحم تو تقصیر نبود

''یعنی اس بے چارہ کا قتل تیری تلوار سے مقدر ہی نہ تھا ورنہ تیرے دل بے رحم نے تو کوئی کسر چھوڑی نہ تھی''

اسلام کو غیروں کی شکایت نہیں اس کو تو مسلمانوں ہی سے شکایت ہے۔

اسلام بزبان حال کہتا ہے۔

طعنہ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو میرے حال پہ رونا ہے یہی

اس تحریک حاضر کے زمانہ میں احکام شرع میں اس قدر تحریف ہوئی کہ زمانہ سابق سے اب تک کبھی بھی اسقدر تحریف نہ ہوئی تھی اور زیادہ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان بدخواہوں کے ساتھ بعض اہل علم پھیل گئے پھر خیر کہاں۔ مگر ہوتا کیا ہے ''قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا'' یعنی کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل گیا گذرا ہوا۔ واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے''

ایسے ہی عقلاء اور ریفارمروں کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے:

گربہ میر وسگ وزیر و موش رادیواں کنند

ایں چنیں ارکان دولت ملک راویراں کنند

"یعنی بلی کو امیر اور کتے کو وزیر اور چوہے کو دیوان بنادیں تو ایسے ارکان دولت ملک کو ویران ہی کردیں گے"

بہرحال اپنا خیال رکھئے گا۔!

〈۲۰〉

انسان کو خریدتا ہے انسان
دُنیا بھی دکان ہو گئی ہے

☆

اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو موٹے قطرے لرزنے لگے۔ آخر کب تک روک پاتا۔!۔ باہر آہی گئے۔ داڑھی نہیں تھی کہ پوشیدہ ہو جاتے، رخساروں سے پھسل کر زمین پر آرہے اور پھر ساتھ ہی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہہ نکلی۔ نمکین قطرے ٹپ ٹپ کر کے نیچے گرنے لگے۔ اس منظر سے میرے جذبات میں بھی کچھ حد تک اُبال آگیا۔ نتیجہ کہ میرے دیدے بھی تر ہو گئے۔!

اُس نے آنکھیں خشک کیں۔ اُس کے آنسو پونچھنے والا اُس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو وہاں درد اور محرومی کا تڑپتا ہوا طوفان نظر آیا۔ وہ ایک دہکتی بھٹی کی طرح سلگ رہا تھا۔ اُس کی دل کی گہرائیوں سے اُٹھنے والے شعلے اُس کی آنکھوں کو لپک رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کی دردناک حالت کی آنچ سے میں بھی محفوظ نہیں رہ سکا اور میری آنکھیں ڈبڈبائیں۔!

میں اس شخص کو بخوبی جانتا تھا۔ اس کے دس بچے تھے، پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔ کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ اس شخص نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلائی اور اُن پر بہت پیسہ خرچ کیا۔ ایک لڑکا ڈاکٹر ہے، ایک انجینئر ہے، ایک پروفیسر ہے، ایک وکیل ہے، ایک بڑا تاجر ہے۔ بیٹیوں میں بھی کوئی ڈاکٹر ہے، کوئی لیکچرر ہے، غرض کوئی کچھ

ہے، کوئی کچھ ہے۔

یہ شخص اکثر کہا کرتا تھا: ''پوز اَپزُ پیو کرُن مگر بچہ پرَ ناوی''، یعنی جائز ناجائز کی باتوں میں زیادہ نہیں پڑے، صرف بچوں کی تعلیم پر دھیان رکھا۔ میں نے کئی بار اس شخص کو یہ مشورہ دیا کہ اپنے بچوں کو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم اور تربیت بھی دلاتے رہو، یہ ان کیلئے اور تمہارے لئے بہتر ہوگا مگر وہ میری بات پر ہمیشہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر متکبرانہ انداز میں کہتا: حضرت میں نے اپنے بچوں کو سماج میں عزت والے انسان بنانے کا تہیہ کیا ہے، مولوی نہیں۔ میں اپنے بچوں کی زندگی بنانا چاہتا ہوں، برباد کرنا نہیں چاہتا۔ پھر واقعی اس کے بچے سماج میں ''عزت والے'' بن گئے اور برباد ہوا تو وہ خود۔!

اس شخص کی بیوی اسے دس بچوں اور اپنے ''عزت والے مشن'' کو چھوڑ کر پرلوک سدھار گئی چنانچہ یہ شخص اپنا ''پوز اَپزُ'' کرتا ہوا بچوں کو پروان چڑھاتا رہا۔

المیہ ایسا ہوا کہ یہ شخص اپنے ''پوز اَپزُ'' کو جاری رکھتے ہوئے جس جس بچے کی شادی کرتا رہا، وہی گھر سے رفو چکر ہو کر دوسری جگہوں پر اپنا گھر بساتا رہا۔ بیٹیوں کو تو خیر سسرال جانا ہی تھا مگر ایک ایک کر کے بیٹے بھی ''راہِ فرار'' اختیار کرتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شخص اپنے اکیلے مکان کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ پہلے کبھی کبھار کوئی خبر بھی لیا کرتا تھا مگر بعد میں وقت کی ''عدیم الفرصتی'' کے سبب یہ معاملہ بھی گول ہو گیا۔ پھر بعد میں جب ٹیلیفون سے ہی یہ معلوم کیا جانے لگا کہ آیا بوڑھا ہے کہ چلا گیا؟ تو اس شخص نے تنگ آ کر ٹیلیفون کی تاریں ہی کاٹ دیں۔ بس اب وہ ہے اور تنہائیاں۔!!!

پچھلے دنوں یہ شخص شدید بیمار تھا، چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ سانسیں اُکھڑنے لگی تھیں۔ درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ کسی میں اتنی فرصت نہ تھی کہ گوشت کے اس متحرک لوتھڑے کو ہسپتال لے جاتا۔!!

بہر حال، آپ اپنا خیال رکھئے گا۔!

کشمیر اور رسید بک

☆

شاید میری بات بعض لوگوں کی ذوق سماعت پر گراں گزرے کیونکہ اِن 'بعض لوگوں' نے جن اسباب سے اپنے نخلِ تمنا کو سر سبز کیا ہے، ایسے اسباب کا تذکرہ ہی تاریخ کے کچھار میں ''سوئے ہوئے شیر'' کو جگانا ہے۔ کم سے کم میری ہمت اتنی ہمالیائی نہیں ہے۔ مجھے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس بات کا اعتراف تو ہے کہ میں نے ایسے ایمان والوں کو دیکھا تو ضرور ہے جنہیں نہ خوف دبا سکا، نہ خوشامد ڈگمگا سکی اور نہ لالچ خرید سکی مگر درجات کے اس زینے پر میں کبھی پہنچ نہیں پایا۔ میں نے ''فصاحت و بلاغت'' کے محض ایسے دریا بہا دیئے جن کا پانی اتنا گاڑھا ثابت ہوا کہ ان دریاؤں میں کاغذ کی ناؤ بھی نہ تیر سکی......!

بہر حال، بتانا یہ چاہتا ہوں کہ کشمیر کی نسبت رسید بک سے کچھ اس حساب سے آراستہ کی گئی ہے کہ ایک کا وجود دوسرے کے بغیر ایسا ہے جیسے لیلیٰ کے بغیر مجنوں، شیرین کے بغیر فرہاد، عذرا کے بغیر وامق، سیسی کے بغیر پنوں، ہیر کے بغیر رانجھا، سوہنی کے بغیر مہیوال! ۔ کشمیر میں جو بھی تحریک اُٹھی، اُس کی تان رسید بک پر ہی ٹوٹی۔

کشمیر میں تحریک اُٹھی اور پھر جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً ہر سمت یعنی چاروں پاسا ''تحریکوں'' کی یلغار شروع ہوئی اور ''تحریکوں'' کی بھرمار کا مشاہدہ ہوا۔ پھر کشمیر کی تحریکوں کے تقاضوں کے عین مطابق رسید بک سامنے آیا اور کچھ اس زور زبردستی اور جوش سے آیا کہ خود کشمیری ہی گھبرایا اور پھر تحریک ہی کا گلا دبایا اور تخلیہ فرمایا۔

نتیجہ یہ کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور تحریک وہی ''72'' ہندسے کی علامت سے جُڑ گئی۔

یہ ''72'' کا ہندسہ کیا ہے؟ ہم بتاتے ہیں۔

حضرت امام حسینؓ جب حجاز سے عراق کیلئے روانہ ہوگئے تو راستے میں بددوؤں کی ایک بھیڑ آپ کے ساتھ ہوگئی تھی۔ یہ سمجھتے تھے کہ کوفہ میں خوب آرام کریں گے۔ آپؓ ان کی حقیقت سے واقف تھے، سب کو جمع کر کے خطبہ دیا: ''اے لوگو! ہمیں نہایت وحشتناک خبریں پہنچی ہیں، مسلم بن عقیل، ہانی بن عروہ اور عبداللہ بن بقطر قتل کر ڈالے گئے، ہمارے طرفداروں نے بے وفائی کی، کوفہ میں ہمارا کوئی مددگار نہیں، جو ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہیے، چھوڑ دے ہم ہرگز خفا نہ ہوں گے''۔

بھیڑ نے یہ سنا تو دائیں بائیں کٹنا شروع ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد آپ کے ساتھ صرف وہی ''72'' لوگ رہ گئے جو مکہ سے ساتھ چلے تھے۔

دس پندرہ سال پہلے کشمیر میں مدارس اسلامیہ کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا، پھر اس سلسلے نے تحریک کا روپ دھار لیا اور حسب روایت رسید بک اس کے ساتھ چپک گیا۔ بالائی علاقوں کی آبادی میدانی علاقوں میں آگئی اور مدرسہ نوازوں نے مسجدوں، مکانوں، دُکانوں اور دفتروں کو بھی ایسا نشانہ بنایا کہ مدرسہ سازوں کو بھی انڈر گراونڈ ہونا پڑا۔

جب قہر خداوندی نازل ہوتا ہے تو پھر مضبوط قلعے بھی غیر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مال و دولت بے کار جاتا ہے۔ زندگی بھیانک بن جاتی ہے۔ ایک مشہور شخصیت

اپنی آپ بیتی میں ایران کے بادشاہ رضا شاہ پہلوی کے آخری ایام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''بیسوی صدی میں چشم فلک نے ایک ایسا عبرتناک نظارہ دیکھا کہ ایک شخص کے دُنیا بھر میں جگہ جگہ مال و دولت کے انبار جمع ہیں۔ جا بجا بڑے بڑے شاہانہ محلات اس کے انتظار میں چشم براہ کھڑے ہیں لیکن زمین کے ساری وسعت اس پر سکڑ گئی ہے اور وہ اپنی قبر کیلئے دو گز زمین کی تلاش میں ساری دُنیا میں مارا مارا پھر رہا ہے''۔

ایک طرف مغرب کا ایک بڑا حلقہ دین اسلام کی شبیہہ کو شبہات کی دھول میں لپیٹنا چاہتا ہے اور دوسری طرف کچھ لوگ بے وقار طریقے سے قرآن کے نام پر دامن پھیلا رہے ہیں۔ چندہ بُری چیز نہیں مگر جب قرآن کے نام پر ہو تو طریقہ بھی باوقار اور عالیشان ہو۔

وہ علماء جن کے کردار میں کوئی بدنما پیچ وخم نہیں، جو سادگی، متانت، حق گوئی اور اخلاص کے جیتے جاگتے نمونے ہیں اور جن کو خدا تعالیٰ نے عارفانہ فراست عطا کی ہے، آگے آنا چاہیے اور دینی عظمت کو خستہ کرانے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔ بے شک، ایسے علماء ہماری وادی میں موجود ہیں اور بے شک مخلص مومنین ہماری وادی میں موجود ہیں۔ بے شک ''بدووں کی بھیڑ'' کٹنا شروع ہو جائے اور ''72'' کا ہندسہ اپنے کو دہرائے۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا۔!

〈۲۲〉

بال کی کھال

☆

بے شک ترقی کی رفتار میں کشمیر ہر میدان میں وقت کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکا ہو اور اس معاملے میں نہایت سست ثابت ہوا ہو مگر اس بات میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ جاہلیت کے سیکٹر میں کشمیر نے خوب ترقی کی ہے۔ میری بات پر اگر کوئی یقین نہ کرنے کی ضد پر اڑا رہے تو اسکو چاہئے کہ کشمیر یونیورسٹی کے سیمناروں میں شریک ہوا کرے اور اسکے بعد بھی اگر اُسے میرے احمقوں کے جائزے کے حوالے پر کوئی شبہ رہا تو اُس بے یقین کو میں یہ یقین دیتا ہوں کہ اُسے میری یہ اجازت ہوگی کہ اپنا خیال نہ رکھئے گا۔!

میں نے اسی کالم کے طفیل آپ حضرات تک پہلے ہی اپنے اس تجربے کو رسائی دی تھی کہ مجھے کشمیر میں تین طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے، ایک وہ جو کام نہیں کرتے، ایک وہ جو کام کرتے ہیں، اور میں نے ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان بھی کیا تھا کہ یہ دونوں اقسام کے لوگ میرے لئے قابل برداشت ہیں مگر جن حضرات نے میرے برداشت کی دھجیاں اُڑا دی ہیں وہ تیسری قسم ہے۔ یہ لوگ نہ کام کرتے ہیں اور نہ کرنے دیتے ہیں۔ زیادہ مصیبت یہ ہے کہ یہ لوگ حق کی تبلیغ اور پیغام کی رکاوٹ پر اپنی بے کاری کا نوے فیصد حصہ بغیر کسی اپیل کے Donate کر رہے ہیں۔

ایک دارالعلوم میں جلسہ ہو رہا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ دارالعلوم انسانوں کے بنانے کے کارخانے ہیں۔ بے بس، بے کس اور مجبور بچوں کو وہی لوگ پالتے ہیں،

پوستے ہیں اور انہیں انسان بناتے ہیں جو خود مفلس اور نادار ہیں۔ اپنی پوری زندگی اسی مشن پر صرف کرتے ہیں۔ ایسے بچوں میں امام، مفتی، عالم، حافظ اور مبلغ بنا کر قائدانہ صلاحیت پیدا کرتے ہیں جنہیں اگر یہ پناہ نصیب نہ ہوتی تو یہ بچے یا تو جرائم پیشہ افراد بن سکتے تھے یا کسی جاہل اور ظالم سرمایہ دار کے گھر میں بے آبرو نوکروں کی حیثیت میں کام کر رہے ہوتے۔ بہر حال جلسہ ہو رہا تھا، اسی دوران ایک شخص اُٹھا اور کہنے لگا: ''میں کہتا ہوں جناب! یہ بچے آگے چل کر بنیں گے کیا؟ چند سو روپیوں پر مسجدوں کے امام! یا کسی اور درسگاہ میں چند سو روپیوں پر معمولی اُستاد! مسلمانوں سے کہئے کہ اپنے بچوں کو ڈاکٹر بنایئے، پروفیسر بنایئے، انجینئر بنایئے، وکیل بنایئے''۔ جب یہ شخص بیٹھ گیا تو میں نے اُسے کہا: ''ارے قبرستان کے راجے، اگر سارے مسلمان ڈاکٹر، انجینئر وکیل اور پروفیسر ہی بن گئے تو پھر تمہارا اعلاج تو ضرور ہو سکتا ہے، تمہارا مکان بن سکتا ہے، عدالت میں تمہارا کیس لڑا جا سکتا ہے، اور تو مروجہ تعلیم پڑھ سکتا ہے، اس سب کام کو مکمل کرنے کے باوجود جب تم مر سکتا ہے تو پھر تمہارا جنازہ کون پڑھ سکتا ہے؟ تمہیں فاتحہ کون بھیج سکتا ہے؟ انسانوں کو مسلمان کون بنا سکتا ہے؟ مرنے کے بعد تمہیں پھر کون ڈھونڈ سکتا ہے؟ وہاں تم صرف پچھتا سکتا ہے، کر سکتا ہے کچھ نہیں.....!''

جلسہ ختم ہوا تو اس احمق نے مجھے جا لیا اور پوچھا: صاحب، کیا مسلمانوں کیلئے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، پروفیسر بننا ضروری نہیں؟ میں نے کہا: کون روکتا ہے؟ جاؤ، اس دارالعلوم سے دو چار بچوں کو اُٹھا کے لے آؤ اور انہیں ڈاکٹر، انجینئر، وکیل اور پروفیسر بناؤ، کون منع کرتا ہے؟ ہمت ہے تو کچھ کر کے دکھاؤ اور پھر آگے بات کر، ورنہ اگر خود تو

کچھ کرنے کی ہمت نہیں تو پھر رات کی رانیوں کی طرح بے شرم نہ بن اور اُن لوگوں کے دلوں کی اپنی بکواس سے ٹھیس نہ پہنچا جنہوں نے ایسے مشن کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ وہ بولا: صاحب، مشن عیسائی بھی چلاتے ہیں انہوں نے اپنے مشن کو Institutionalise کیا ہے، اُن کے مشینری سکولوں سے جو بچے نکلتے ہیں ڈاکٹر بنتے ہیں، وکیل بنتے ہیں، پروفیسر بنتے ہیں، انجینئر بنتے ہیں۔ میں نے کہا: کم بخت تو بے فکری کا مریض ہے۔ ذرا غور کر! ان مشینری سکولوں سے نکلنے والے بچے جو ڈاکٹر، انجینئر، وکیل اور پروفیسر بن گئے، کیا تم نے اُن میں کوئی کومٹمنٹ دیکھی ہے؟ یہ بچے جب ڈاکٹر بن جاتے ہیں تو پیسے کا حصول اُن کا مقصد ہوتا ہے، یہی ڈاکٹر پھر کمیشن کی لالچ میں مفلس بیماریوں کی مجبوریوں کا اندازہ کئے بغیر اُن سے ایسے مہنگے ٹیسٹ کروا لیتے ہیں اور ایسی مہنگی دوائیں دیتے ہیں کہ یہی بیمار پھر اپنے مکان، زیور اور زمینوں کو بیچتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ یہی ڈاکٹر پھر بیماروں کو حقارت و نفرت سے دھتکارتے رہتے ہیں، یہی ڈاکٹر پھر بیماروں کو گندی نالی کے کیڑے مکوڑے جان کر اپنی لاپرواہیوں اور تغافل سے موت کے منہ میں پہنچا دیتے ہیں۔ اپنی لمبی لمبی گاڑیوں، اونچے اونچے بنگلوں اور بڑے بڑے باغات اور شادی بیاہ کے موقعوں پر لاکھوں روپے کے بے جاہ اسراف سے یہی ڈاکٹر اِس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ہم ڈاکٹر ہی اسلئے بنے ہیں کہ لوگوں کے بدن سے خون کے آخری قطرے تک کو نچوڑ لیں، کسی کو یقین نہ آئے تو ہماری جائدادوں کو دیکھ کر یقین کیلئے گنجائش پیدا کرلے۔ ہاں، یہ ہم ہی ہیں کہ زیادہ کمیشن کے حصول کیلئے نقلی دواؤں کو فروغ دیا ہے۔

اور ایسے ہی ڈاکٹر مشینری سکولوں کا حاصل ہے۔ وجہ یہ کہ ان سکولوں میں خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا، وجہ یہ کہ ان سکولوں میں آخرت پر یقین حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایسے اداروں کے پیڑ سے جرائم کے تلخ پھل سماج کو نصیب میں آتے ہیں، اسی طرح ان انجینئروں، پروفیسروں اور وکیلوں کو دیکھ لیجئے جو ان سکولوں کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں۔ اب رہے ہمارے یہ ''تھرڈ کلاس کے دارالعلوم'' اور ان کے ''تھرڈ کلاس'' اساتذہ..... آ کیا کرتے ہیں! سماج سے دھتکارے ہوئے، دھکے کھائے ہوئے، بے سہارا، درد اور محرومی کے طوفان سے تڑپتے ہوئے، بے آبرو، بے وقعت اور مسترد کئے ہوئے یتیم، لاچار، غریب، بے کس نونہالوں کو جمع کرتے رہتے ہیں اور پھر انہیں اپنی چھاؤں میں لے لیتے ہیں، پھر انہی بچوں کو واپس سماج میں ایسا بنا کر پیش کر کے دیتے ہیں کہ یہ لوگوں سے ملی نفرت، دھتکار اور دھکوں کے بدلے پورے سماج کو پیار و محبت کا اسلامی پیغام سنانے لگتے ہیں۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے والا بچہ گلا کاٹنے والا ڈاکٹر، سماج میں رشوت کا زہر پھیلانے والا انجینئر، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے والا وکیل، تاریکی کو فروغ دینے والا پروفیسر نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسے کشادہ شامیانے کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے جو پھر کسی بے سہارا، کسی یتیم، کسی دھتکارے ہوئے، کسی لاچار و غریب بچے کو دیکھ کر اپنی پناہ میں لے لیتا ہے، اور پھر اُسے محبت و اخوت، ہمدردی اور ایثار کا مجسمہ بنا کر سماج کو واپس کر دیتا ہے۔ اس طرح ان دینی درسگاہوں کا سفر جاری رہتا ہے۔ اصحاب صفہ کے طریق پر چلنے والے ان مدارس سے جو لوگ نکلتے ہیں وہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ ہوتے ہیں، وہ اشرف علی تھانویؒ

ہوتے ہیں، وہ علامہ ابن قیم ہوتے ہیں، وہ ابوالحسن علی ندویؒ ہوتے ہیں۔ وہ مولانا رشید احمد گنگوہی ہوتے ہیں، وہ شاہ اسماعیل شہید ہوتے ہیں، وہ سید احمد شہید ہوتے ہیں، وہ مولانا حالی ہوتے ہیں، وہ علامہ ابن کیثر ہوتے ہیں،..... اور پھر جب حق و باطل کے درمیان ٹکر شروع ہوتی ہے تو مشینری سکولوں سے نکلنے والے ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور وکیل نہ جانے کہاں دُبک کر بیٹھ جاتے ہیں اور آگے آتے ہیں: عبداللہ بن زبیر..... حجاج بن یوسف کے مقابل میں، امام ابوحنیفہؒ..... خلیفہ منصور کے مقابل میں، امام احمد بن حنبل..... معتصم باللہ کے مقابل میں، امام غزالی..... شاہ سلجوتی کے مقابل میں، ابن تیمیہ.... تاتار کے مقابل میں، مجدد الف ثانی.... جلال الدین اکبر کے مقابل میں، شاہ ولی اللہ.... فرقہ اثنا عشریہ کے مقابل میں، شاہ اسماعیل شہید.... راجہ رنجیت سنگھ کے مقابل میں، شاہ عبدالعزیز.... انگریز کے مقابل میں۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا.....!

جو اصول گلستان سے واقف نہ تھے اُن کے ہاتھوں چمن کا نظام آ گیا!

☆

افسوس ہی نہیں بلکہ صد افسوس یہ ہے کہ کشمیر میں ''صحافت'' اُن ہاتھوں میں بھی پڑ گئی ہے جو بہت ضرر رساں ہیں۔ یہ لوگ جہاں صحافتی ذمہ داریوں اور آداب سے نا آشنا ہیں وہاں اُن کے عوامی ترجمان ہونے کا اخباری دعویٰ بھی ''گریٹ ٹڑ'' ہے۔ اِن لوگوں نے صحافتی پیشے کو ہی نہیں بلکہ اپنے بے ربط اور متعفن خیالات سے دین اسلام اور تبلیغی جذبے کو بھی زک پہنچائی ہے۔ ذہین ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان صحیح بھی ہو۔ ذہین شیطان بھی ہے اور یہ بات روایات سے ثابت ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کا نکاح ملکہ بالقیس سے ہوا تو ملکہ کی پنڈلیوں پر بال اُنہیں ناگوار گزرے۔ اُنہوں نے انسانوں کو بلایا اور یہ بال صاف کرنے کی ترکیب کے معاملے پر اُن سے صلاح لی۔ اُنہوں نے بالوں کو اُسترے سے صاف کرنے کا مشورہ دیا مگر حضرت کو یہ بات پسند نہ آئی۔ پھر اُنہوں نے جنوں کو طلب کیا اور اُن سے بھی اس معاملہ پر بات کی تو اُنہوں نے مشورہ دیا کہ حضرت اس معاملے میں شیطانوں کے دماغ کو کام میں لانا زیادہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ شیطانوں کو بلایا گیا تو اُنہوں نے چونے اور کچھ اور چیزوں سے ایک ایسا سلوشن تیار کر لیا کہ جب یہ ملکہ بالقیس کی پنڈلیوں پر استعمال، ہوا تو اُن کی ٹانگیں شیشے کی مانند صاف اور چمکیلی ہو گئیں۔

یہ بھی مشہور ہے کہ ایک دفعہ یورپ میں علامہ اقبالؒ سے پوچھا گیا کہ کیا بات ہے کہ تمام پیغمبر ایشیا میں ہی پیدا ہوئے اور یورپ میں ایک بھی نہیں؟ تو اُنہوں نے مذاق میں کہا کہ جب زمین بنی تو خدا اور شیطان نے بھی پینیتر ابدلا۔ خدا نے ایشیا اپنے پاس رکھ لیا جب کہ یورپ شیطان کے حصے میں آیا۔ چنانچہ پیغمبر ایشیا میں پیدا ہوتے گئے اور سائنسدان یورپ میں .....۔ بہرحال، ذہانت ایک چیز ہے اور فہم دوسری۔ فہم کا ہونا اللہ تعالیٰ کے بڑے انعامات میں سے ہے۔ اللہ کے نیک بندے فہیم ہوتے ہیں۔ وہ ہر فعل اور عمل سے پہلے اپنی چشم بینا سے یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اُن کے افعال اور اعمال کے دور دور تک کیا اثرات ہو سکتے ہیں اسلئے فضول افعال اور اعمال اُن سے سرزد نہیں ہوتے۔ جو فہم سے عاری ہوتا ہے بے شک ذہین ہو سکتا ہے اس لئے ایسا آدمی یہ دیکھے بغیر کہ اُس کی حرکتوں سے انسانیت کو کیا نقصان ہو سکتا ہے، محض اپنی ذہانت کے مظاہرہ کا دیوانہ ہوتا ہے اس لئے اکثر ''درو پہ گنہ'' پھینکتا رہتا ہے۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک دفعہ پاکستان کے سابق صدر فیلڈ مارشل ایوب خان نے کہا تھا: ''معمولی سے معمولی ڈسپنسری میں مرہم پٹی کرنے اور ٹیکا لگانے کیلئے جو کمپاؤنڈر رکھے جاتے ہیں اُنہیں اس کام کی پہلے سے باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے لیکن قوم کے ذہن میں صبح و شام ٹیکا لگانے کیلئے جو لوگ صحافت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں ان کیلئے کسی قسم کی ٹریننگ حاصل کرنا بالکل لازمی نہیں (یعنی اُنہیں اخلاقی ذمہ داریوں اور صحافتی آداب کا احساس نہیں ہوتا)۔'' بتایا جاتا ہے کہ صدر ایوب اکثر کہا کرتے تھے کہ بڑے سے بڑے جھوٹ کو پرنٹنگ پریس کی مشین سے گزار کر کاغذ پر پھیلا دیا

جائے تو کئی لوگوں کی نظر میں وہ قابل قبول اور قابل اعتبار بن جاتا ہے اسلئے وہ مذاق سے پرنٹنگ پریس کو ذہنی جنگ کا اسلحہ خانہ کہا کرتے تھے۔

سود اقمارِ عشق میں شریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ تو یہ بھی نہ ہو سکا

یہی شعر جب میں نے ایک نام نہاد صحافی کو سنایا تو، بقول شہاب کے، اُس کی توند تسلے میں پڑی ہوئی باسی اوجھڑی کی طرح گدگدائی اور گلے سے غوغوغا کی کچھ رندی ہوئی آوازیں برآمد ہوئیں جو اس بات کی دلیل تھی کہ ''صحافی'' صاحب قہقہہ فرمارہے ہیں۔

تعظیم الگ چیز ہے اور ادب دوسرا معاملہ ہے۔ ایک سلسلہ گفتگو میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا: میرے نزدیک تو تہذیب اور ادب یہ ہے کہ کسی کو تکلیف نہ پہونچے۔ تعظیم کا نام ادب نہیں۔ ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ لوگ مجھ کو یوں کہتے ہوں گے کہ اچھا قصائی سے پالا پڑا۔ اور میں کہتا ہوں کہ اچھا بیلوں سے پالا پڑا۔ کوئی کھر مارتا ہے، کوئی سینگ مارتا ہے، اگر ڈنڈا نہ چلاؤں تو اور کیا کروں؟

چنانچہ میں یعنی نذیر جہانگیر نے بھی حضرت تھانویؒ کی یہ بات گرہ میں باندھ لی ہے اور بعض اوقات ''اپنا خیال رکھئے گا۔!'' کے ڈنڈے کا استعمال کر کے انسانیت کے دُشمنوں کی اپنی استعداد کے مطابق خبر لیتا ہوں۔

دین اسلام میں کسی بے گناہ کو تکلیف پہنچانے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

حدیث میں درندے کی کھال پر بیٹھنے تک کی ممانعت آئی ہے۔ اس سے شان سبیعت (درندگی) پیدا ہوتی ہے، لیکن بے غیرتی کی بھی گنجائش نہیں ہے اس لئے "الحر بالحر" کا معاملہ بھی ہے۔

کچھ وقت پہلے ایک معروف سیاسی لیڈر صاحب کی صاحبزادی نے ایک ہندو لڑکے سے شادی کر لی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ لڑکی کے والدین نے ایسے بندھن کو پسند نہیں کیا اور لڑکی کے گھر والوں میں سے کسی نے بھی اس شادی میں شرکت نہیں کی بلکہ والد صاحب اپنے عرق انفعال کو پونچھنے کیلئے کچھ وقت کے لئے کہیں اور مقیم ہو گئے۔ مجھے جتنا افسوس اس شادی پر ہوا اس سے زیادہ اُس "صحافی" کی بے عقلی پر ماتم کرنے کو جی چاہا جس نے ایسے بندھن پر بُرا ماننے والوں پر جہاں چوٹ کی تھی وہاں متعفن قے کی طرح کئی مثالیں دیکر یہ بیہودہ جواز پیدا کرنے کی بھی کوشش کی تھی کہ مسلم لڑکی کے کسی غیر مسلم سے شادی کرنے پر شرمندہ ہونا جہالت ہے۔!

صد افسوس یہ ہے کہ صحافت کا بیڑا اُٹھانے کی بات وہ کر رہے ہیں جو دراصل اس پیشے کا بیڑا ہی غرق کر رہے ہیں۔ قرآن واضح طور اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ خدا کے نزدیک صرف اسلام ہی مقبول دین ہے اور دوسری جگہ یہ ہدایت ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ یعنی اس میں ففٹی ففٹی چلنا یعنی ففٹی ایک ناؤ میں رہے اور ففٹی دوسری کشتی میں سوار ہو، ایسا شخص کبھی پار نہیں ہوگا بلکہ ڈوب جائے گا اور ایسا کشتیوں کیلئے بھی ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے۔

خندہ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا تھی!
تم بھی ہنستے ہو میرے حال پر رونا ہے یہی

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا۔!

جی ہاں، خیال رکھئے گا!

☆

اس شہر میں بڑی انوکھی روایت تھی۔ پانچ برس گذر جانے کے بعد بادشاہ کو اپنے ہی درباری اُٹھا کر ایک ایسے ہیبتناک اور دہشت ناک جنگل میں ڈالتے تھے جہاں پر موذی جانوروں، آدم خور درندوں اور خطرناک کیڑے مکوڑوں کا بسیرا تھا۔ جوں ہی جنگل کے یہ باسی انسان کو پالیتے تھے تو آناً فاناً اُسے کاٹ کاٹ کر اور کھا کھا کر یوں چٹ کر جاتے تھے کہ نہ اس انسان کی ہڈی ہی بچ جاتی تھی اور نہ ہی پسلی باقی رہ جاتی تھی۔ اس طرح شہر پر پانچ برس حکومت کرنے اور عیش و آرام کے بعد جب بادشاہ کو اس جنگل میں پھینک دیا جاتا تھا تو عبرتناک موت اُس کا سواگت کرتی تھی۔ ہر پانچ برس کے بعد بادشاہ کو جنگل کے واسیوں کے حوالے کرنے کے بعد یہ شہر والے تمام علاقوں میں دوبارہ منادی کرواتے تھے کہ اس شہر کو ایک بادشاہ کی ضرورت ہے، خواہشمند شخص آکر تخت سنبھال سکتا ہے۔!

اس بار جب پرانے بادشاہ کو جنگل میں چھوڑا گیا اور نئے بادشاہ کی ضرورت پیش آئی تو منادی کرائی گئی، مگر کوئی شخص بادشاہ بننے پر آمادہ نہیں ہوا۔ کئی بار منادی کروائی گئی مگر کوئی سامنے نہیں آیا۔ کوئی شخص پانچ سال کے بعد اپنے آپ کو دردناک انجام سے دوچار کرانے پر تیار نہیں تھا۔ اس شہر میں ایک بدصورت، مفلس اور غریب شخص رہتا تھا اس بے چارے کو نہ پہننے کیلئے پورے کپڑے میسر آتے تھے اور نہ پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوتا تھا۔ تین تین چار چار روز بعد روٹی مل جایا کرتی تھی۔

جب اس شخص نے منادی سنی تو خیال آیا: اپنی زندگی بھی بھلا کوئی زندگی ہوئی۔! مشکل سے کھانے کو سوکھی روٹی ملتی ہے اور وہ بھی کئی کئی روز بعد۔! تن ڈھانپنے کیلئے پورے کپڑے بھی نصیب نہیں ہوتے۔! سونے کیلئے ہمیشہ بس کھلا میدان دیکھا ہے۔! صورت ایسی ہے کہ میری طرف دیکھنے سے بھی لوگوں کو کراہت ہوتی ہے! شادی میرے لئے ایک خوبصورت خواب ہے۔! یہ جینا بھی بھلا کوئی جینا ہے۔! بہتر یہی ہے کہ پانچ سال عیش کی زندگی گذاری جائے پھر موت جیسے بھی ہو آجائے۔!!!

چنانچہ یہ بدصورت شخص اُٹھا، درباریوں کے پاس گیا، معاہدے پر دستخط کر دیئے اور پانچ سال کیلئے بادشاہ بن گیا۔ پانچ برسوں کو گذرنا تھا تو گذر گئے۔ وقت کے نقارے پر جب پانچ برسوں کی چوٹیں پڑ گئیں تو درباری پالکی لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: عالی جاہ، اُٹھ جایئے اور معاہدہ کی شرط پوری کر دیجئے، پالکی میں چڑھ جایئے کیونکہ ہمیں آپ کو اُسی جنگل میں چھوڑنا ہے جہاں پر آپ سے پہلے آپ کے پیشرو پہنچائے گئے۔ مگر درباری یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ بادشاہ خوشی، اطمینان اور سکون سے اُٹھا اور پالکی میں چڑھ گیا۔ درباریوں نے اس سے پہلے ایسی نوعیت نہ دیکھی تھی۔ آج تک وہ جس بادشاہ کے پاس بھی پانچ برس گذر جانے کے بعد پہنچ چکے تھے تو وہ پالکی دیکھ کر ہی چلایا تھا، چیخا تھا، رویا تھا، اور گڑگڑایا تھا۔ آج تک کوئی بھی بادشاہ ازخود اس پالکی میں سوار نہیں ہوا تھا بلکہ زبردستی اور گھسیٹ کر درباریوں نے اُسے پالکی میں گویا ٹھونس دیا تھا۔ بادشاہوں نے کود کود کر بھاگنے کی کوششیں کی تھیں مگر شہر والوں نے بادشاہوں کے فرار کی یہ تمام کوششیں ناکام بنادی

تھیں اور انہیں زدوکوب کر کے اور آدھ موا کر کے دوبارہ پالکی میں چڑھا دیا تھا۔

اس لئے جب یہ نیا بادشاہ پانچ برس گذرنے کے بعد ہنسی خوشی پالکی میں سوار ہوا تو تمام لوگ حیران ہوئے۔ بہر حال، اس بادشاہ کو بھی اُس مخصوص دور دراز جنگل میں چھوڑا گیا جہاں اُس کے پیشرو بادشاہوں کو دھکیلا گیا تھا۔

اس واقعہ کے کئی برس بعد اسی جنگل سے کسی قافلے کا گزر ہوا۔ یہ قافلہ جب اس جنگل کے قریب پہنچا تو اس قافلے کے لوگ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ یہ جنگل اب کوئی خطرناک جگہ نہیں رہ گئی ہے بلکہ اب یہاں بڑے بڑے باغات، بڑے بڑے محل اور عیش وآرام کی تمام چیزیں میسر ہیں۔ یہاں پر غلاموں اور کنیزوں کی اچھی خاصی تعداد بھی تھی۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ پوری جاگیر کسی بڑے رئیس کی ہے۔ جب قافلے والے رئیس سے ملاقات کیلئے گئے تو وہ انہیں بڑی گرمجوشی سے ملا مگر قافلے والے یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ یہ رئیس تو وہی بادشاہ ہے جسے چند برس پہلے شہر والوں نے مرنے کیلئے یہاں چھوڑا تھا۔

رئیس اِن لوگوں کی حیرت کو بھانپ گیا اور اُس نے اُن سے کہا: ''دیکھو بھائی لوگو، میں آپ لوگوں کی حیرت کو دور کرتا ہوں۔ جب مجھے شہر والوں نے بادشاہ بنایا تو مجھے یہ معلوم تھا کہ پانچ برس بعد وہ مجھے اسی جنگل میں دھکیل دیں گے۔ یہاں اُنہوں نے میرے پیشرو بادشاہوں کی بھی دھکیل دیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہاں خطرناک اور موذی جانوروں نے انہیں بے دردی سے مارا تھا، چنانچہ جب میں بادشاہ بنا، میں نے وہ پانچ برس عیش پرستی اور غفلت میں نہیں گذارے بلکہ میں اُن پانچ برسوں کے دوران

خفیہ طور اور چوری چھپے اس جنگل کو تمام خطرناکیوں اور ہیبتناکیوں سے پاک وصاف کرنے میں لگا تھا۔ میں اس ویرانے کو خوبصورت اور آرام دہ جگہ بنانے کی کوششوں میں سرگرم رہا، پھر جب پانچ برس بعد مجھے یہاں پہنچانے کے لئے لے جایا گیا تو نہ ہی میں تڑپا، نہ رویا اور نہ ہی چیخ و پکار ہی کی۔!

بہرحال، آپ بھی اپنا خیال رکھئے گا۔!!

〈۲۵〉

ترقی ہو کر رہے گی

☆

قدرت اللہ شہاب ایک نامور ادیب ہیں۔ وہ پاکستان کے سابق صدر جنرل ایوب خان کے سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ اپنی آپ بیتی میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جاپان جانے سے پہلے ہم برما میں بھی چند روز کیلئے ٹھہرے تھے۔ واپس پر پھر ایک روز وہاں پر رُکے۔ اس وقت برما کے وزیر اعظم مسٹر اونو تھے۔ وہ بدھ بھکشوؤں کی طرح ایک درویش سیرت انسان تھے۔

ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہر سال کم از کم ایک ماہ کسی غار یا معبد میں معتکف ہو کر عبادت اور مراقبے میں بسر کرتے تھے۔ انہوں نے صدر ایوب خان سے پوچھا کہ ان کا جاپان کا دورہ کیسا رہا؟ صدر ایوب نے جاپانی قوم کی انتھک محنت، لگن، اور ترقی کی خوب تعریف کرتے ہوئے کہا:

''جاپانی لوگ واقعی مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔''

یہ سُن کر اونو کھل کھلا کر ہنسے اور بولے: ''بے چارے بدنصیب جاپانی۔ انسان کی عظمت انسان بننے میں ہے، مشین بننے میں نہیں۔''

وزیر اعظم اونو نے قوموں کی مادی ترقی کے متعلق اپنا فلسفہ کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جس کا لُبّ لباب یہ تھا کہ یہ زمانہ مادی ترقی کا زمانہ ہے۔ رفتہ رفتہ ترقی ساری دُنیا کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گی جس طرح کہ برف، مٹی اور ریخ کا

تو وہ پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتا ہے۔ اگر کوئی ملک مادی ترقی سے بچنے کی کوشش کرے بھی تو وہ اس میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ہم سب مادی ترقی کی زد میں بے دست و پا مقید ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ترقی یافتہ ہوکر بھی انسان ہی رہیں۔ ایسی مشین نہ بن جائیں جس میں حرکت تو تیز ہو لیکن روح ندارد۔!!"

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا۔!

عورت

☆

کچھ وقت پہلے وادی کی ایک ذمہ دار تنظیم کی طرف سے ایک جلسے کا اہتمام ہوا تھا اور تقاریر کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا گیا تھا اس کا عنوان تھا 'عورتوں کے حقوق'۔

مجھے بھی اس جلسے میں شریک ہونے کے لئے دعوتی کارڈ ملا۔ اس کارڈ کی عبارت پڑھ کر میرے ذہن کے کئی گوشوں سے کئی خیال اُبھر آئے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ اگر عورت کو اپنی شان اور عظمت کا احساس ہو جائے تو یہ احساس عورت کو عمر بھر مستی کے ایسے جھولے میں جھلا سکتا ہے کہ عورت کا ہر لمحہ جذبہ تشکر میں خالق مطلق کے حمد وثنا میں صَرف ہوتا رہے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورت کو اتنا اونچا مقام بخشا ہے کہ بے ساختہ اُس کی تعظیم کو جی چاہتا ہے۔

عورت کا مقام یہ ہے کہ، بقول ایک نامور ادیب کے، عورت کے بطن کا مقدس صندوق خالق مطلق نے اپنی تخلیقی شاہکار کی امانت کیلئے منتخب کیا ہے۔

عورت کا مقام یہ ہے کہ ایک عورت (حضرت ہاجرہؓ) نے صفا و مروہ پر دوڑ لگائی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر حاجی کیلئے یہ لازم کر دیا کہ وہ عورت کے اس عمل کی تقلید کرے۔ اس عمل کو مناسک حج میں شامل کیا گیا۔ اولیاء ہیں، ابدال ہیں، اقطاب ہیں، سب ایک عورت کے اس عمل کی تقلید کر رہے ہیں۔ کیسا مقام بخشا ہے اللہ تبارک و

مولانا طارق جمیل فرماتے ہیں کہ آسمان کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ اس میں جو خلاء ہے اُس کے ستانوے فی صد حصے میں تاریکی ہے یعنی صرف تین فی صد حصے میں روشنی ہے، اور یہ جو محض تین فی صد حصہ روشن ہے اس میں پانچ ارب کہکشائیں ہیں۔ ایک ایک کہکشاں میں دس دس کھرب سیارے ہیں۔ جس کہکشاں میں ہم رہتے ہیں اُس کا فاصلہ بیس لاکھ نوری سال ہیں، یعنی ایک لاکھ 86 ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے بیس لاکھ سال اگر سفر کیا جائے تب جا کر ہماری کہکشان ختم ہوگی، اور ایسی 5 ارب کہکشائیں ہیں۔ ہم 17 کہکشاؤں کے ایک مجموعے میں رہتے ہیں اور اِن کا فاصلہ بیس لاکھ نوری سال ہیں۔ 5 ارب کا کون حساب لگائے گا.......!؟ پھر آسمان کا اوپر، پھر پہلے، دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں آسمان کا حساب کون لگائے گا......! پھر ساتویں آسمان کے اوپر جنت ہے اور جنت اُٹھی ہے عرش تک...!

اللہ تعالیٰ نے ماں کے روپ میں عورت کو ایسا مقام بخشا کہ جنت کو اُس کے قدموں کے نیچے لایا۔ اندازہ لگائیے، عورت کتنی بلند ہوگئی....!

ہندوستان کے بادشاہ ابراہیم لودھی کی بہن قطب القطاب حضرت شاہ عبدالقدوس قدس سرہ گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کی مریدتھیں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اگر بزرگوں کے طریقہ کے خلاف نہ ہوتا تو میں اس عورت کو خلافت دیتا۔ یہ اس لئے نہیں کہا کرتے کہ اس عورت سے کوئی قیمتی اور بڑے بڑے تحائف اور ہدیئے وصول

کرتے تھے بلکہ حضرت نے کبھی ان سے کوئی ہدیہ وغیرہ قبول ہی نہیں کیا۔ یہ بات وہ اس عورت کا تقویٰ دیکھ کر فرمایا کرتے تھے، اور ایسی ہی عورتوں کیلئے اعزاز وانعامات ہیں۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

بات سے بات بنے

☆

ادب کا عصا ٹیکتے ہوئے زندگی کا کچھ سفر میں نے بھی طے کیا ہے۔ شعر بھی کہے، افسانے بھی بنائے، اور ناٹک بھی لکھے۔ مگر جب میں نے محسوس کیا کہ بے کاری کا دیمک اب اس عصا کو چاٹ رہا ہے اور اگر سنبھلنے کی کوشش نہ کی تو دھڑام سے گر جانا یقینی ہے تو میں نے شائستگی سے لاٹھی ایک کونے میں رکھ دی اور خدا کا دامن پکڑ کر چلنا شروع کر دیا۔

ادب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بعض اوقات ادیب کا دماغ خوامخواہ ہوا میں اُڑنے لگ جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس میدان میں تعریفوں کے حوالے سے شدید مبالغہ آرائی ہوتی ہے۔ چاپلوسی کے تعلق سے ایک واقعہ یاد آیا۔ معروف اُردو ادیب قدرت اللہ شہابؔ اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں کہ ایک روز پاکستان کے سابق صدر جنرل ایوب خان نے حسب معمول اپنے 'سیاسی فلسفہ' پر ایک طولانی تقریر ختم کی تو ایک سینیئر افسر وجد کی کیفیت میں آ کر جھومتے ہوئے اُٹھے اور سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر عقیدت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولے: ''جناب، آج تو آپ کے افکارِ عالیہ میں پیغمبری کی شان جھلک رہی تھی''۔ یہ خراج تحسین وصول کرنے کیلئے صدر ایوب نے بڑی تواضع سے گردن جھکائی۔ یہ سینئر افسر مرزائی عقیدہ سے تعلق رکھتے تھے۔ معاً مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں صدر ایوب سچ مچ اس جھوٹ موٹ کے

اُڑن کھٹولے میں سوار ہو کر بھک سے اوپر کی طرف اُڑنے نہ لگیں۔ چنانچہ اس غبارے کی ہوا نکالنے کے لئے میں بھی اسی طرح عقیدت سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت احترام سے گذارش کی: ''جناب، آپ ان صاحب کی باتوں میں بالکل نہ آئیں کیونکہ انہیں صرف خود ساختہ پیغمبروں کی شان کا تجربہ ہے''۔

اس کے برعکس بزرگان دین کا مزاج دیکھئے۔ حیاتِ انور کے صفحہ 327 پر درج ہے کہ ایک موقعے پر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ کے اختتام وعظ پر ایک مولوی صاحب نے فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب کی شان ایسی ہے اور آپ ایسے بزرگ ہیں وغیرہ۔ حضرت فوراً کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ''حضرت! ان صاحب نے غلط کہا ہے، ہم ایسے نہیں ہیں بلکہ ہمیں تو یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ ہم سے گلی کا کتا اچھا ہے۔ ہم اس سے بھی گئے گذرے ہیں''۔

بہر حال، بات ہو رہی تھی ادب کی۔ کچھ وقت پہلے میں نے ایک ڈرامہ لکھا تھا جس کا ٹائیٹل تھا 'بہتے جسم'۔ یہ ڈرامہ ریڈیو کشمیر سے کئی بار نشر ہوا۔ ڈرامے کی کہانی ایک قلم کار کے گرد گھومتی ہے۔ جس بے چارے کو دو وقت کی تو کیا، ایک وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی ہے۔ یہ قلم کار مفلسی اور بھوک سے تنگ آتا ہے اور پھر سچائی کا درس دینے والا قلم کا یہ سپاہی ہیرا پھیری پر اُتر آتا ہے اور اسی دھندے سے اپنا پیٹ پالنے لگتا ہے۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔

ایک آدمی ایک حکیم صاحب کے پاس گیا اور قبض کی شکایت کی۔ حکیم صاحب نے دوا کی ایک گولی دیدی۔ یہ آدمی دوسرے روز پھر آ گیا اور قبض بدستور

ہونے کی شکایت کی۔ حکیم صاحب نے دوا کی دو گولیاں دیدیں۔ تیسرے روز یہ شخص دوبارہ آ گیا اور حکیم صاحب سے کہا کہ حضرت رفع حاجت نہیں ہوا۔ اب کی بار حکیم صاحب نے آٹھ گولیاں کھانے کی صلاح دی۔ چوتھے روز جب یہ شخص پھر آ گیا اور قبض دور نہ ہونے کی شکایت کی تو حکیم صاحب حیران ہوئے اور پوچھا: ''آپ کام کیا کرتے ہیں؟'' وہ آدمی بولا: ''حضرت، میں کشمیری قلم کار ہوں'' حکیم صاحب نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اس آدمی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا: ''یہ لیجئے۔! اور جایئے پہلے کچھ کھا لیجئے''۔

بہر حال، بات ہو رہی ہے، ڈرامے کی اس قلم کار کی بیوی بزرگوں کی بڑی معتقد ہے اور ایک نیک عورت ہے۔ جب اسے اپنے شوہر کی جعلسازیوں کا علم ہوتا ہے تو وہ سکتے میں آتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ اُسے مرنا گوارا ہے مگر وہ اُس کی جعلسازیوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اُسے کہتی ہے کہ جھوٹے آدمی کی سہاگن بننے کی بجائے سچے آدمی کی وِدھوا بننا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو غیرت دلاتی ہے کہ اگر اُس نے ہیرا پھیری کا دھندہ نہ چھوڑا تو وہ جان دیدی گی۔ پھر وہ اپنے قلم کار شوہر کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتی ہے۔ بزرگ تمام روئیداد سن کر قلم کار کے لئے دُعا کرتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں بہت تلخ بندہ غریب کے اوقات

طلب دُنیا بھی بُری چیز ہے اور مفلسی بھی عذاب۔ بقدر ضرورت دنیا حاصل

کرنا اچھی بات ہے البتہ دُنیا کے پیچھے ہی پڑ جانا ہلاکت ہے۔ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ دُنیا کی مثال آدمی کے سایہ کی سی ہے، اگر کوئی اپنے سایہ کی طرف دوڑے تو وہ اس کے آگے ہی آگے بھاگتا نظر آئے گا اور اگر سایہ کو پسِ پشت ڈالے تو وہ خود اس کا پیچھا نہ چھوڑے۔

آگے یہ ہوتا ہے کہ بے کار قلم کار کو غیر متوقع طور کئی برس بعد اپنا ایک جگری دوست اور قلم کار ساتھی مل جاتا ہے۔ اپنے اس ساتھی کی شان وشوکت دیکھ کر بے کار قلم کار دنگ رہ جاتا ہے۔ ساتھی قلم کار کو بھی اپنے بے کار قلم کار اور اُس کی اہلیہ کے چہروں سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ افلاس کے تھپیڑوں نے اُن کے حلیہ کا جغرافیہ کچھ ایسا بگاڑ دیا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان داڑھی ہی ایک امتیاز باقی رہ گئی ہے، دوسرے خدوخال میں بھی دونوں کی 'قدریں' مشترک ہیں۔ دونوں کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں، دونوں کے گال ہڈیوں سے چپک گئے ہیں، دونوں کے چہروں پر ایسی زردی چھائی ہوئی ہے جیسے زندگی کا آفتاب پوست کے پردے پر زرد رنگوں کے خزانے لٹاتا ہوا روپوش ہو رہا ہو اور چہرے کی کائنات پر آنکھوں کی روشنی بھی دھیمی پڑ گئی ہے۔

دولت کمانا گناہ نہیں، دولت کے حصول کو مقصد بنانا خطرناک ہے۔ دنیا میں جتنی بھی بُرائیاں ہیں یہ دولت کے جنون میں پھیلتی ہیں اور پھیلائی جاتی ہیں۔ اسلئے میرا ذاتی خیال ہے کہ خدا کے نیک بندوں کے پاس زیادہ سے زیادہ دولت جمع ہونی چاہیئے تا کہ یہ طاقت غلط اور بدکار لوگوں کی جھولیوں میں آسانی سے نہ جاسکے۔

حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ ایک بلند پایہ کے صحابی ہیں، عشرہ مبشرہ میں

سے ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جنت کی بشارت دی ہے۔ روایت ہے کہ جب حضرت عوفؓ نے انتقال فرمایا تو اُن کے ورثے میں تین ارب بیس کروڑ دس لاکھ سونے کے دینار پائے گئے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں گھوڑے اور اونٹ تھے۔ سونے کی اتنی اینٹیں تھیں کہ تقسیم کے لئے جب اُن کے کاٹنے کی نوبت آئی تو آرے ٹوٹ گئے۔ مگر ذاتی زندگی نہایت سادگی اور خدا کی یاد میں گذاری۔

دولت کا صحیح مصرف اور استعمال صرف خدا کے نیک بندوں سے ہوتا ہے، باقی لوگ اس قوت سے فتنے ہی پھیلاتے ہیں۔ اسراف، نمود ونمائش اور دوسرے بُرے کاموں پر جب یہ قوت استعمال ہوتی ہے تو پورا سماج ناسور بن جاتا ہے اور غریبوں کا استحصال شروع ہونے لگتا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ مسلمان کے لئے سب سے بڑا اثاثہ عزت نفس کا احساس ہے۔ بقول کسے: سونے چاندی کی دنیا میں گو اس اثاثے کی کوئی وقعت نہیں لیکن انسانیت کے ترازو میں اس کا وزن بھاری ہے۔ علامہ اقبالؒ کا ایک شعر یاد آیا:

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

علامہ اقبالؒ کا ایک اور شعر یاد آیا:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

اُن کا ایک اور شعر یاد آرہا ہے:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

اُن کا ہی ایک شعر ہے:

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستان کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیّاد

انسان کبھی کبھی نہ جانے کیوں اور کیسے ترنگ میں آجاتا ہے اور پھر بنیادی موضوع سے ہٹ کر دوسرے معاملات کو زیرِ بحث لاتا ہے، مگر جب گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اُن 'دوسرے معاملات' کا بھی 'بنیادی موضوع' سے ایک ربطہ ہوتا ہے اور نئی نئی دلچسپیاں اصلی موضوع کو بھی رنگین بنادیتی ہیں۔

اس وقت علامہ اقبالؒ کی شاعری کا دل میں اُبال سا ہے تو وہی کیفیات ظاہر کررہا ہوں:

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہاں کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

☆

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

☆

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

☆

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخی افلاک میں ہے زارو زبوں

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں حضرت ابوذر غفاریؓ اشترا کی اصول کو مانتے تھے۔ ایک مفکر کا کہنا ہے کہ وہ اسلامی معاشرے میں مالداروں کے وجود کے خلاف تھے اور ان کی دولت کو غریبوں کا حق سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کو کھلم کھلا ظاہر کیا۔ دوسرے اصحاب صفہ بھی اُن کے ہم خیال تھے لیکن حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے خیالات میں متشدد تھے حضرت عمرؓ جو اسلام کی ابتدائی تاریخ میں سب سے بڑے مجتہد تھے، اُن کی قرآنی توجیہہ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنا استدلال قرآن کی اُن آیتوں پر مبنی قرار دیا تھا جن میں اللہ کی راہ میں سب کچھ خرچ کر دینے کا ذکر ہے۔ ایک آیت میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے اللہ کی راہ میں

خرچ کر دینے کی نسبت دریافت کیا تو خدا کا حکم ہوا کہ کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ سب خرچ کر دو۔ اسی طرح اور بھی چند آیات میں اسی طرح کی ہدایت ہے لیکن حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کا فرمانا تھا کہ اگر سب کچھ خرچ کر دینے کا حکم ہوتا تو زکوٰۃ اور وراثت کے قانون بنانے سے کیا فائدہ تھا؟۔ حالانکہ ان کی نسبت قرآن میں بڑی تفصیل موجود ہے۔ دراصل سب کا سب خرچ کر دینے کی ہدایت نصب العینی حیثیت رکھتی ہے، اگر کوئی ایسا کرے تو اچھا ہے لیکن اُمت کیلئے میانہ روی کی تعلیم ہے۔ اگر زکوٰۃ اور وراثت کے اسلامی اصول پر پوری طرح عمل کیا جائے تو دولت ایک جگہ دو پُشتوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ اسلام کی معیشت میں یہی مقصد پیش نظر رکھا گیا ہے کہ دولت ایک جگہ زیادہ عرصے تک نہ رہے ورنہ اس کی وجہ سے لازمی طور پر خرابی پیدا ہوگی، اسی وجہ سے حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرام نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی قرآنی توجیہہ کو تسلیم نہیں کیا۔

انسانی زندگی کیلئے یقیناً رزق ضروری ہے لیکن انسانی روح اسباب معیشت سے بلند ہے، معیشت اس کا مقصود نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔

فقر کا تصور بھی اقبال کے یہاں سائل کے تصور سے بالکل مختلف ہے، اصول فقر پر عمل کرنے والا سائل نہیں ہوسکتا، اس کا دل بے نیاز ہر دو جہاں سے غنی ہوتا ہے:

میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی ورنجوری

بہر حال، ڈرامے کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ بے کار قلم کار اپنے ساتھی قلم کار کو اپنی پریشانیوں اور بدحلیوں کی تفصیل بتاتا ہے۔ بے کار قلم کار دوست کی 'چیختی چلاتی' ہسٹری سے ساتھی قلم کار کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے دوست سے کہتا ہے کہ تم جانتے ہو کہ میری حالت تم سے زیادہ ہی بدتر تھی اور میں تم سے بھی زیادہ پریشان تھا، چنانچہ روزی کی تلاش میں بیرون ریاست گیا، مزدوری کی، رکشا چلایا اور اسی طرح روکھی سوکھی روٹی سے اپنا پیٹ پالتا رہا۔ پھر ایک روز مجھے وہاں اپنا ایک پرانا دوست ملا، بالکل اچانک، ایسے ہی جیسے میں آج تم سے ملا۔ وہ بھی قلم کار تھا، اُس کی حالت بہت اچھی تھی، میرا یہ دوست سیاسی لیڈروں کیلئے تقریریں لکھا کرتا تھا، اُس نے مجھے بھی کئی سیاسی لیڈروں سے ملایا اور اُن کیلئے تقریریں لکھوالیں، میری تقریریں، ہٹ ہوگئیں، جس کے نتیجے میں میرے پاس اثر ورسوخ بھی آیا اور ڈھیر ساری دولت بھی۔

یہاں مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ بہت سے سیاسی لیڈر ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی Commitment نہیں ہوتی۔ ان کا کوئی ایمان، کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اُنہیں بس اپنے مفادات سے سروکار ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں صحافیوں کی ایک خاصی تعداد بھی اُسی زُمرے میں آتی ہے۔ اُن کے اخبار میں اسلام کے خلاف مضمون چھاپنا چاہیں، وہ شوق سے چھاپ دیں گے۔ پردے کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ہو تو فرضی خطوط سے کریں گے۔ سود کی حمایت میں بات کرنی ہو تو 'فصاحت و بلاغت' کے دریا بہادیں گے۔ علماء کی تذلیل کرنی ہو تو اپنی بے وقار ٹوپی میں سیکولر کلغی کو جھومتا رکھنے

کیلئے قلم کی نب بھی گھسا دیتے ہیں۔ یہ اسلئے کہ انہیں خدا کی ناراضگی کی پرواہ نہیں ہوتی بلکہ اپنے آپ کو یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ 'غیر جانبدار' اور 'حق' کے ترجمان ہیں، جو محض کذب بیانی ہے۔

ذیل کے پیراگراف میں جو خیال درج کر رہا ہوں وہ خیال تو قدرت اللہ شہاب کا ہے تاہم میں نے اُن کے الفاظ کو اپنے مزاج کے زیر و بم کو تال دیا ہے:

بہت سے لوگوں کے نزدیک ملک کی سلامتی اور استحکام کا راز فقط اس بات میں مضمر ہے کہ حالات کے اُتار چڑھاؤ میں ان کے ذاتی اور سراسر انفرادی مفاد کا پیمانہ کس شرح سے گھٹتا یا بڑھتا ہے۔ ایسے لوگ قابل رحم ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نہ تو وطن دشمن ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن پر غداری کا الزام لگانا چاہیئے۔ حریفانہ ذہنیت کے یہ لوگ حرص و ہوس کی آگ میں سلگ سلگ کر اندر ہی اندر بزدلی کی راکھ کا ڈھیر اُن کو اُڑا کر تتر بتر کر دیتا ہے۔ ان کا اپنا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ ان کا اصلی وطن محض ان کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو سرزمین بھی ان کی خودغرضی، خود پسندی، خود فروشی اور منافقت کو راس آئے وہ وہیں کے ہو رہتے ہیں۔

خیر، ہم ڈرامے کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ ساتھی قلم کار بے کار قلم کار کو اپنے ساتھ لیتا ہے۔ وہ بھی سیاسی لیڈروں کی تقریریں لکھنے لگتا ہے۔ اس کی 'تقریریں' زیادہ کامیاب ہو جاتی ہیں چنانچہ یہ بھی بڑا آدمی بن جاتا ہے اور اس کے پاس بھی بڑی مقدار میں دولت آ جاتی ہے۔ پھر یہ قلم کار ایک عالیشان بنگلہ خریدتا ہے، موٹر گاڑی لیتا ہے اور اب اس کا ایک بڑا دفتر بھی ہوتا ہے۔ کام کار بھی زیادہ

بڑھ جاتا ہے اور وہ کئی ملازم بھی رکھ لیتا ہے۔

ملازموں پر ایک بات یاد آئی۔ آج کل لاکھ ڈھونڈنے پر بھی گھریلو ملازم دستیاب نہیں ہوتا ہے۔ جہاں تک میری اطلاعات ہیں، امیر گھرانوں کی 'خوجہ بائیاں' نہایت ہی شدید دشواریوں بھی پھنس گئی ہیں۔ ان گھرانوں میں جو ملازم تھے وہ فرار ہونے لگے ہیں۔ اُدھر 'خوجہ بائیوں' کو کام کرنے کی عادت تو ہے نہیں کیونکہ انہوں نے اپنے گلے میں فیشنوں کی عادت ڈالی ہے اور گھریلو کام کی جانب اُن کی عادت باقی نہیں رہی۔ اب جو ملازم دھڑادھڑ بھاگ رہے ہیں تو 'خوجہ بائیوں' کو گھر سنبھالنا نہیں آرہا ہے۔ فیشن اور بناؤ سنگھار کیلئے فرصت نہیں مل رہی ہے، وہ پریشانی الگ۔ کچن کے کام کاج میں ہاتھ پاؤں کی 'چکنائیاں' جارہی ہیں، وہ پریشانی الگ۔ سالن میں کبھی نمک زیادہ پڑ رہا ہے اور کبھی بے نمک ہی پک رہا ہے، وہ پریشانی الگ۔ سہیلیوں سے گھنٹوں 'غیبتوں کے تبادلے' کے شغل کیلئے اب وقت نہیں مل رہا ہے، وہ پریشانی الگ۔ اب کپڑے بھی خود دھونے پڑ رہے ہیں، کمروں کی صفائی بھی خود کرنی پڑ رہی ہے، کھانا بھی پکانا پڑ رہا ہے، اور مہمان کوئی آئے تو اُس کی میزبانی بھی خود ہی کرنی پڑ رہی ہے، یہ پریشانی الگ۔ اب گھر سے باہر قدم رکھنا مشکل ہو رہا ہے، کیونکہ آج کے وقت میں ایک گھنٹے کیلئے بھی کوئی گھر آدمیوں سے خالی رہے تو چور حضرات کی سراغ رساں ایجنسیاں جیٹ طیاروں کی طرح فوراً حرکت میں آتی ہیں اور آدمیوں سے خالی مکان کو کچھ ایسا خالی کر دیا جاتا ہے کہ پھر مکان میں ایک ایسا گلاس بھی دریافت نہیں ہوتا جس سے بے ہوش مالک مکان کو کم سے کم پانی پلایا جا سکتا، اور یہ پریشانی

آگے ڈرامے میں یہ ہوتا ہے کہ ایک دن ایک سیاسی لیڈر اس قلم کار کے پاس آتا ہے، اُسے یونیورسٹی میں ایک سیمنار کیلئے دانشوروں اور پروفیسروں کو خطاب کرنا ہوتا ہے، موضوع ہوتا ہے 'آج کے دور میں دانشوروں کا رول'۔

ویسے ہمارے یہاں بھی ایک یونیورسٹی ہے، اور وہاں بھی بہت سے دانشور رہتے ہیں، اپنا زیادہ وقت دانش میں کم اور ایک دوسری کی ٹانگیں کھینچنے میں گزارتے ہیں۔

بہرحال، یونیورسٹی کے نام پر زیب داستان کی اس بیان آرائی کے بعد میں دوبارہ اپنے ڈرامے کی طرف آتا ہوں۔ آگے ہوتا یہ ہے کہ سیاسی لیڈر اس موضوع کے حوالے سے اپنی تقریر لکھوانا چاہتا ہے۔ وہ قلم کار کے سامنے اپنی حاجت بیان کرتا ہے اور ساتھ میں یہ بھی گذارش خدمت کرتا ہے کہ اس سے پہلے ایک دوسرے جلسے کیلئے اُس نے جو تقریر لکھوا کے لی تھی اُس پر تو سامعین کی طرف سے 'واہ واہ' ضرور ہوئی مگر خود ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا، جس پر قلم کار سیاسی لیڈر سے کہتا ہے کہ آپ کو 'واہ واہ' والی تقریر چاہیئے یا سمجھ والی؟ یہ سن کر لیڈر صاحب گھبرا جاتا ہے اور نہایت ہی انکساری کے ساتھ التماس کرتا ہے: ''حضرت، سمجھ کو ماریئے گولی، مجھے واہ واہ والی تقریر ہی چاہیئے.......''۔

سیاسی لیڈروں کی بات چلی تو اتنا عرض کروں کہ ہمارے بہت سے سیاسی لیڈر اخلاق و آداب میں اکھڑ اور شائستگی اور سوجھ بوجھ میں بڑی حد تک بے نیاز ہیں۔ دولت کی فراوانی، اقتدار کی بدلگامی، انداز حکومت کی بدعنوانی اور عدل و انصاف اور

اخلاق کی سوختہ سامانی نے بہت سے سیاسی لیڈروں کو اُس منزل پر پہنچا دیا ہے جس کے بعد بقول قدرت اللہ شہاب کے اگلی منزل عذاب الٰہی باقی رہ جاتا ہے۔

لیڈر صاحب قلم کار کو فیس ادا کرنے کے بعد چل دیتا ہے تو ایک منسٹر صاحب آدھمکتے ہیں۔ اُن کو بھی ایک تقریر کی ضرورت ہے، مگر اُن کا موضوع ذرا مختلف ہے،۔ اُنہیں یہ تقریر ایک پاگل خانے میں کرنی ہے۔ دراصل پاگل خانے میں پاگلوں کی ایک اچھی خاصی تعداد علاج کے بعد ٹھیک ہوگئی ہے اور اُنہیں پاگل خانے سے رخصت کرنے پر ایک تقریب کا انعقاد ہو رہا ہے۔ اسی تقریب پر ٹھیک ہونے والے پاگلوں سے منسٹر صاحب کو خطاب کرنا ہے اسلئے تقریر لکھوانا چاہتے ہیں۔

دوسرے دِن جب سیاسی لیڈر صاحب اور منسٹر صاحب تقریریں لینے کیلئے آجاتے ہیں تو وہاں ستم ظریفی سے قلم کار کے سیکریٹری سے تقریریں بدل جاتی ہیں جو تقریر منسٹر صاحب کو دینی تھی وہ سیاسی لیڈر کے پاس چلی جاتی ہے اور جو سیاسی لیڈر کیلئے تھی وہ منسٹر کے ہاتھ لگتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیاسی لیڈر یونیورسٹی میں جب دانشوروں اور فلاسفروں سے مخاطب ہوتا ہے تو یوں کہنے لگتا ہے:

"...... ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ کا پاگل پن ٹھیک تو ہوا ہے مگر ابھی آپ لوگ پوری طرح خطرے سے باہر نہیں ہیں، اور اگر آپ نے مکمل احتیاط سے کام نہ لیا تو پورا سماج آپ کے شر کی زد میں آسکتا ہے اور فتنے فسادات آپکے ہاتھوں دوبارہ برپا ہوسکتے ہیں۔ اسلئے قبل اسکے کہ عام لوگ مار مار کر آپ لوگوں کا کچومر نکال دیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ فی الحال خاموشی سے ہی کام لیں۔ اگرچہ آپ کا دماغ بہت حد تک ٹھیک

کرنے کی کوشش تو کی گئی ہے مگر بکواس کا جو مادہ آپ کے اندر ہے اُس کو پوری طرح باہر نکالنا ڈاکٹروں کے بس کی بات نہیں۔ اسلئے آپکو یہی صلاح دی جاتی ہے کہ بکواس کے اس مادے کو باہر ہی نہ لائیں!"۔

اور جو منسٹر صاحب 'پاگلوں' سے مخاطب تھا وہ کچھ یوں کہہ رہا تھا۔

"..... کون کہتا ہے کہ آپ کا آج کے دور میں رول مختصر ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آج کے دور میں آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ قوم کو آپ سے بہت اُمیدیں وابستہ ہیں اور اس قوم کا مستقبل محض آپ کے ہاتھوں میں ہی محفوظ ہے۔ آپ کو آگے آنا ہے اور اپنے زریں خیالات سے سماج و ملک میں روشنی پھیلانی ہے۔ اگر روشنی کہیں ہے تو آپ کے پاس ہے ورنہ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ آپ آگے آیئے اور قوم کی نیا پار لگایئے....."

یہاں پاگلوں کے تعلق سے ایک لطیفہ یاد آیا امریکہ سے دماغی بیماریوں کی تربیت پاکر ایک ڈاکٹر صاحب اپنے یہاں آئے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ پاگل خانے میں اُن کی ڈیوٹی لگی تو اُنہوں نے ساتھی ڈاکٹروں سے کہا کہ میں جدید طریقوں اور نئی ٹیکنالوجی کی بنیادوں پر پاگلوں کو ٹھیک کرنے کا ہُنر سیکھ کے آیا ہوں اور یہاں بھی میں ایسے ہی تجربات شروع کرنے والا ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ اُس نے ایک پاگل کو اپنے پاس لایا اور اُسکے سامنے پانچ روپے کا سکہ اور بیس کا نوٹ رکھ دیا، پھر کہا کہ تم دو میں سے جو چاہو ایک لے سکتے ہو۔ پاگل نے پانچ کا سکہ اُٹھالیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوسرے روز بھی اسی پاگل کو بلایا اور یہی تجربہ کیا مگر پاگل نے پانچ کا ہی سکہ اُٹھالیا۔

تیسرے روز بھی ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر مسلسل ایک ماہ تک اس پاگل پر یہ تجربہ آزماتا رہا مگر پاگل برابر پانچ کا ہی سکہ اُٹھاتا رہا۔ آخر ایک ماہ کے بعد امریکی تربیت یافتہ ڈاکٹر نے پاگل سے پوچھ لیا: ''میں تمہارے سامنے ایک مہینے سے پانچ روپے کا سکہ اور بیس روپے کا نوٹ رکھ رہا ہوں مگر تم کیوں پانچ کا ہی سکہ اُٹھاتے ہو بیس کا نوٹ نہیں؟''
جس پر پاگل نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: ''ڈاکٹر صاحب، اگر میں نے بیس روپے کا نوٹ اُٹھالیا ہوتا تو آپ پہلے ہی دن یہ کھیل ختم کر لیتے........''

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا!

پیر صاحب

☆

ایک نئے پیر صاحب ایک شہر میں نئے ہی آئے تھے۔ ایک دن اپنے نئے مریدوں میں وعظ فرما رہے تھے۔ انہیں نئی نئی نصیحتیں کر رہے تھے۔ انہیں اپنی زندگی بہتر بنانے کے نئے نسخے بتا رہے تھے۔ پھر مریدوں کی جانب ذرا زیادہ غور سے دیکھا۔ تو ایسا لگا کہ جیسے ان کے پرانے بھیجے میں کوئی نئی بات نہیں جا رہی ہے۔ وہ تلملا گئے اور عاجز آ کر مجمع سے کہا "میں نے گدھوں کو انسان بنایا ہے مگر تم لوگوں سے تو میں ہار گیا!"...... اس دوران وہاں سے ایک سیدھی سادھی بڑھیا کا گذر ہوا۔ جب اس نے نئے پیر صاحب کے گدھوں کے انسان بنانے کی بات سنی تو وہی جم گئی۔ جب مرید چلے گئے تو وہ پیر صاحب کے پاس آئی۔ نہایت عاجزی سے اور گڑگڑاتے ہوئے فریاد کی "پیر صاحب! میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ گھر میں اکیلی ہوں۔ سارا کام خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ صرف ایک گدھا میرے پاس ہے۔ آپ تو گدھوں کو انسان بنا ہی دیتے ہیں۔ مجھ پر بھی کرم کیجئے اور میرے گدھے کو بھی آدمی بنا دیجئے......" پیر صاحب نے بڑھیا کا رنگ دیکھا تو لگا کہ یہ پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے۔ اس نے بڑھیا سے کہا۔ جا تو اپنا گدھا میرے پاس چھوڑ آ اور پھر ایک ہفتے کے بعد آنا۔ تب تک میں نے اسے آدمی بنا دیا ہوگا۔ بڑھیا خوشی خوشی گھر گئی اور پھر اپنا گدھا، پیر صاحب کے حوالے کر کے خود ایک ہفتے تک سنہری خوابوں کو بنتی رہی...... ایک ہفتے کے بعد جب بڑھیا پیر صاحب کے

پاس آئی اور 'آدمی' کا تقاضا کرنے لگی تو پیر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ اس کے مکان کے قریب ہی ایک سیاسی لیڈر ایک مجمع میں تقریر کر رہا تھا۔ پیر صاحب سوچ سے واپس آئے اور بڑھیا سے کہا "بڑی بی! ۔ تیرا گدھا تو آدمی ضرور بنا۔ مگر بنانے کے عمل میں اس میں 'مسالہ' ذرا زیادہ مقدار میں پڑ گیا۔ اس لئے وہ آدمی بنتے ہی تقریریں کرنے لگا......" سیاسی لیڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے بڑھیا سے کہا۔ "تم اس آدمی کو دیکھ رہی ہونا۔ بس یہ گدھا بھاگ کر اب وہاں تقریر کرنے بیٹھ گیا ہے!" بڑھیا کو اپنے گدھے کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے رسی تو گھر سے ہی ساتھ لائی تھی۔ چنانچہ وہ مجمع میں گئی اور سیاسی لیڈر کے گلے میں رسی ڈالتے ہوئے کہنے لگی "چل او گدھے سیدھی طرح اپنے گھر نہیں تو وہی پرانے ڈنڈے پڑیں گے"۔

دیکھا جائے تو اپنے یہاں بھی بہت سے لوگوں میں "مسالہ" ذرا زیادہ ہی مقدار میں نظر آ رہا ہے۔ جس کے سبب یہ لوگ صرف بول رہے ہیں اور کرتے کچھ نہیں۔ قول ہے عمل نہیں۔ ہر کوئی خود تبدیل ہوئے بغیر دوسرے کو تبدیل ہونے کی تبلیغ کر رہا ہے۔ غیبت، چغلی اور بہتان طرازی نے انسان کو جانور سے بدتر بنا دیا ہے۔ ایسے لوگوں میں ہی "مسالے" کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا۔

اپنا خیال رکھئے گا

☆

بات سچ بھی کہیں تو لوگ کہتے ہیں بولتا ہے۔ مگر ہم ہیں کہ بولے بنا نہیں بنتا۔ کیونکہ مجبوری ہے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر ضرور آتا ہے اور جب ہم اپنے بھولے پن میں بولتے ہیں تو لوگ طعنہ مارتے ہیں کہ دیکھو بولتا ہے۔ آنے والے مہینوں کے دوران میں شادیاں ہی شادیاں ہیں۔ گویا شادیوں کا موسم ہے۔ جن کی شادیاں ہونی ہیں انہیں مبارک ہو اور جو حسرتوں کو ہی دل کے جھولے میں جھونٹے دے رہے ہوں، ان کی مراد بھی خدا تعالیٰ پوری کرے۔ یہاں ذرا اپنے ایک دوست کے کارخیر کا بھی ذکر کرتا چلوں۔ جب شادی ہوئی تو وہ بولتا تھا اور اس کی بیوی سنتی تھی۔ یہ معاملہ ایک سال رہا۔ دوسرے سال بیوی بولتی رہی اور وہ سنتا رہا۔ اب نوبت یہاں پہنچی ہے کہ وہ دونوں بولتے ہیں اور محلے والے سنتے ہیں۔ بہر حال بات ہو رہی تھی شادیوں کی۔ اسلام میں نہ خوشیوں کے موقعوں پر زیادہ ہنگامے اور غل غپاڑا مچانے کی گنجائش ہے اور نہ ہی صدمے میں زیادہ ہوہا کی اجازت ہے۔ ہر چیز میں اعتدال ہے۔ مگر انسان اپنی حماقتوں پر اتنا نازاں ہے کہ اس دنیا کو ہی دارالقرار سمجھ بیٹھا ہے۔ اسی لئے شادی کو ضرورت کے بجائے اپنی بڑائی کا ڈنڈورا پٹوانے کا موقعہ بناتا ہے۔

انسان غفلت کی دلدل میں اس طرح دھنس رہا ہے کہ پتھر تک اس کے انجام سے خوفزدہ ہیں۔ مگر وہ خود بے چارہ بے خبر ہے۔ بہر حال بات تھی شادیوں کی۔ اپنے

یہاں شادیاں کیا ہوتی ہیں یوں سمجھ لیجئے بے حیائی کا اطلاع عام ہوتا ہے۔ عورتوں کی فیشن پریڈ ہوتی ہے۔ وہ عورتیں جو اپنے پاؤں کو قبر میں لٹکانے کی حد پر پہنچ گئی ہوتی ہیں وہ بھی جوانی جتلانے کی کھینچا تانی میں بھونڈے پن تک اتر آتی ہیں۔ دعوتوں میں جانے والی خواتین اپنے شوہروں سے نئے سوٹ سلوانے کے تقاضے کرتی ہیں۔ گویا کہہ رہی ہوں 'عاشق اگر ہے پیارے کوڑی نہ رکھ کفن کو'۔ تا کہ مقابلے میں ہم کسی چھوٹی ماں کی بیٹیاں نہ لگیں۔ دلہن کے دماغ میں پہلے ہی اس خطرے کا الارم بجتا ہے کہ خواتین کی فیشن پریڈ میں اس کی شناخت باقی نہیں رہنے والی! اس لئے وہ بھی میدان میں اتر آتی ہے اور اس خطرے کا یوں مقابلہ کرتی ہے کہ عورتیں ایک دوسرے سے پوچھتی رہتی ہیں کہ دلہن جی نے پہنا کیا ہے آخر؟۔ اور غلامانِ جوروان غیرت کے طبلے پر حیا کے جنازے کی دھن بجاتے رہتے ہیں۔ پھر جب کھانے کی باری آتی ہے تو ''ترامیوں کے اڈے'' بھی پکوانوں کی اندھا دھند یلغار سے لرز اٹھتے ہیں۔ مگر انسانی پیٹ کا جہنم احتجاج میں اوں بھی نہیں کرتا۔ دیگچیوں سے ترامیوں تک مار کرنے والے لمبے چمچوں کے میزائل پکوانوں کے اٹیم گراتے رہتے ہیں اور انسانی منہ اور پیٹ اپنے زبردست تال میل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ترامیوں کے ملبے صاف کرتے رہتے ہیں۔ پھر دوسرے دن ڈاکٹروں کے کلینکوں کے باہران کی قطاریں لگتی ہیں اور مہنگے ٹسٹوں کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یوں ''صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ زندگی یونہی تمام ہوتی ہے''۔

بہرحال اپنا خیال رکھئے گا!

اور جب موت آتی ھے

☆

وادی کے ایک مؤقر انگریزی ماہنامے ''دی ٹرتھ'' کے اپریل ۱۹۹۹ کے شمارے میں ایک آرٹیکل شائع ہوا تھا جو ڈاکٹر پروفیسر نور احمد صاحب نے اپنے بعض تجربات اور واقعات کے تعلق سے لکھا ہے۔ ڈاکٹر فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر کی حیثیت تقریباً ایک سو مسلمانوں کی موت کے وقت میں اُن کے پاس موجود تھا۔ ان میں صرف تین ایسے شخص تھے جن کے مُنہ سے آخری وقت میں کلمہ شہادت جاری ہوا جب کہ باقی لوگ کچھ اوّل فول بکتے ہوئے رخصت ہوئے۔ داکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ایک شخص مرتے وقت (Milk shake) مانگ رہا تھا کئی لوگ فلمی اداکاروں کے ناموں کی گردان کرتے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کر گئے جب کہ بعض اپنی جائداد کی دہائی دیتے ہوئے جان دے گئے۔

اسی دنیا میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موت کے وقت مُنہ سے ''اُولے اُولے، بولے بولے، ہُو ہُو ہُو'' گانے جاری ہونے والے کا ٹھکانہ کہاں ہوگا! جو شخص اس دنیا میں جس شغل کے ساتھ مست رہتا ہے خاتمہ بھی اُسی حال پر ہوتا ہے اور پھر آخری حال پر جنت اور جہنم کا فیصلہ بھی ظاہر ہے۔

ایک راوی نے یہ روایت بھی کی ہے کہ گذشتہ دنوں جب کرکٹ کے ایک فین کو (جس نے کرکٹ کے ورلڈ کپ کے عشق میں پورے چالیس دن ریڈیو اور ٹیلی

ویژن پر کومنٹری سُننے کا چلہ کاٹا تھا) موت نے آدبوچا تو آخری وقت میں وہ یہ کلمہ دہرا رہا تھا:

''سری ناتھ کی فل ٹاس بال۔ لارا نے سکوائر ڈرائیو کیا۔ بال بلے کے کنارے پر لگا۔ اینڈ ہی از آوٹ۔۔۔'' اور پھر ''ہی از آوٹ'' کی ہی ایک زوردار چیخ پر اُس کا جسم بے حرکت ہو گیا۔ اب آپ خود اندازہ لگائیے کہ جب قبر کے ہولناک اندھیرے اور تنہائی کے اس گھر میں نکیر منکر نے اُس کی تفتیش کی ہوگی تو وہاں نہ سری ناتھ آیا ہوگا اور نہ لارا ہی نظر آیا ہوگا۔ وہاں صرف اُس نے اپنے ''بداعمال کی شاٹ پچ باولنگ'' ہی دیکھی ہوگی اور ایسی باولنگ سے تو سر کی ہڈیاں تک چکنا چور ہو جاتی ہیں۔ اللہ رحم کرے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ گذشتہ دنوں ایک ایسے شیر فروش کو موت نے لپک لیا جو دودھ میں پانی ملانے میں اچھی خاصی شہرت پا چکا تھا۔ اور اس مہارت کے اعزاز میں مقامی حلقے سے ''واٹر گجری'' کا لقب بھی حاصل کیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ جان کنی کے عالم میں وہ ''پانی پانی'' کہہ رہا تھا۔ جب قریب ہی بیٹھے لوگ کہتے کہ ''لو یہ ہے پانی'' تو واپس کہہ دیتا ''دودھ میں ملاؤ''۔ پھر کچھ دیر کے بعد دوبارہ ''پانی پانی'' کہہ دیتا اور لوگ پھر کہہ دیتے کہ ''لو یہ ہے پانی'' اور وہ وہی جواب دیتا ''دودھ میں ملاؤ''۔ اسی مکالمے بازی میں اُس کی جان نکلتی رہتی اور آخر ''دودھ میں ملاؤ'' کے کلمے پر ہی اُس کی روح پرواز کرگئی۔

بہر کیف، سب لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ وہ بھی اللہ کے بندے ہیں جن کے

لئے قبر جنت کا باغ بن گئی۔

ایک دن محمد اسلم طوسیؒ اور نعمی طرطوسی حضرت رابعہ عدویہ بصریؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور کہنے لگے: ''جو تو شیخی مارتی تھی کہ میں دونوں جہاں سے فارغ ہو گئی ہوں، اب بتا وہ تیری حالت کیا ہو گئی؟'' رابعہ سے جواب آیا: ''مجھ کو وہ چیز مبارک ہو جو میں نے دیکھی اور اب دیکھ رہی ہوں''۔

رابعہؒ کی وفات کے وقت بہت سے مشائخ، درویش، اہل اللہ حضرت کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ سفینتہ الاولیاء میں درج ہے کہ حضرت نے اُن کی طرف دیکھا اور اُن سے فرمایا: ''اب آپ لوگ باہر جائیے اور خدا تعالیٰ کے قاصدوں کے لئے جگہ خالی کر دیجئے۔ کچھ دیر کے بعد کمرے سے سورۃ فجر کے آخری تین آیات کی آواز سنائی دی جن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے نفس! تو نے آرام حاصل کیا میرے ذکر سے کہ تو شاکر تھا زحمت میں اور تو نے صبر کیا زحمت میں۔ دنیا سے واپس ہوا اپنے پروردگار کی طرف ایسی حالت میں کہ پسند کرنے والا ہے اُس کا جو کچھ تجھے دیا گیا ہے۔ وہی خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ پس میرے شائستہ بندوں کے زمرے میں ہے مقربان کے ہمراہ جنت میں۔''

بہر حال اپنا خیال رکھئے گا!

ٹائی والے صاحب کی دُرگت

☆

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ مغربی تہذیب کے دلدادہ اور آجکل کے دلدارِ جدیدیت کیا کبھی بھی نہیں سوچتے کہ جہاں یہ لوگ اپنی شناخت مٹا رہے ہیں وہاں ذلت کا جغرافیہ بھی اپنے مقدر کی ہسٹری میں رقم کر رہے ہیں؟ بہر حال، وہ نہ بھی سوچیں مگر میں اُن پر ضرور ہو چتا ہوں۔

اب دیکھئے یہ لوگ آپس میں اسلام علیکم ورحمت اللہ کہنا ہی بھول گئے ہیں۔ کیا خوبصورت اور بڑھیا سلام اسلامی تہذیب نے مسلمانوں کے لئے عطا کیا ہے۔ سبحان اللہ! یعنی تم پر اللہ کی سلامتی اور رحمت ہو۔ کتنی بڑی دُعا ہے۔ سُنتے ہی جیسے کانوں میں شہد گھولنے لگتا ہے۔ مگر مغربی تہذیب کی اندھی تقلید میں ہم نے سلام کے بجائے ''گڈ مارننگ'' اور ''گڈ آفٹرنون'' اور ''گڈ ایوننگ'' اور وغیرہ وغیرہ گڈ کہنا شروع کر دیا۔ مصیبت یہ ہے کہ ایسے سلاموں کے لئے کلائی پر گھڑی کا ہونا لازم ہے کہ ہر دوسرے شخص کو دیکھتے ہی گھڑی دیکھی جائے تا کہ وقت کی مناسبت سے ''گڈ'' کہا جائے۔ اب ذرا سوچئے کہ ایک شخص کی ماں مرگئی ہو اُس بے چارے کی مارننگ کہاں گڈ ہو سکتی ہے۔ یہ ''سلام'' ہی غلط ہے۔ ہے کہ نہیں؟

اب دیکھئے: اسلامی تہذیب میں ہمیں کہا جا رہا ہے کہ مسلمان بے غیرت نہیں ہونا چاہئے کیونکہ بے غیرتی انسان کے لئے سب سے بڑی گالی ہے۔ عورت کو

مکمل طور پردے میں رہنا چاہئے تاکہ وہ محض اور صرف اپنے خاوند کی تسکین کا سامان بنے اور لوگوں کی بد نظریوں کا شکار نہ ہو سکے۔ مگر مغربی تہذیب کا تقاضا ہے کہ عورت سڑکوں پر نیم عریاں حالت میں پھرا کرے تاکہ پوری آبادی اس صنف سے لذّت لے سکے۔ گویا عورت نہ ہوئی شارع عام بن گیا۔ واہ رے مغربی تہذیب واہ!!

اسلامی تہذیب نے ہمیں مسواک دیا تاکہ مُنہ کی بیماریاں دور ہوں اور مُنہ کی بدبو دور ہو۔ مگر ہم نے کیا کیا، مسواک چھوڑ دیا اور مغربی تہذیب کی سگریٹ پکڑ لی، جس نے بیماریاں بھی دیں اور بدبو بھی۔

اب آپ ہی بتائیے کہ کیا ہم سوچتے ہیں؟

اب دیکھئے نصرانیوں کے بقول حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا تو انگریزوں نے صلیب کی نشانی کے طور پر اپنی گردنوں میں ٹائی لٹکا دی۔ مگر تعجب ہے اپنے آپ کو مسلمان جتلانے والے حضرات بھی پھانسی کی نشانی اپنی گردنوں میں ڈالے پھرتے ہیں۔ گذشتہ دنوں ٹائی پہنے والے ایک شخص کو ایک بس کنڈیکٹر نے زوردار تھپڑ رسید کیا۔ بے چارے ٹائی والے کی کوئی خطا بھی نہ تھی۔ پھر بھی اُسے طیش نہ آیا۔ پھر کنڈیکٹر نے ایک اور مارا۔ مگر ٹائی والے حضرت کو غصہ نہیں چڑھا۔ پھر میں نے ہی خشمناک ہو کر ٹائی والے شخص سے پوچھا۔ ارے اُو بے غیرت! تھپڑ پہ تھپڑ کھائے جارہا ہے اور کسی ردِ عمل کا مظاہرہ بھی نہیں کرتا! وہ شخص پھر بھی خاموش رہا۔ بس سے اُترنے پر وہ میرے پاس آیا اور کہا:

''میں اتنا احمق نہیں تھا کہ کنڈیکٹر سے اُلجھ پڑتا۔ ہاتھا پائی میں اگر میری ٹائی

اُس کے ہاتھ آجاتی تو کیا میں جان سے ہی ہاتھ دھو نہ بیٹھتا!''

بہرحال، اپنا خیال رکھیے گا۔۔۔!

شیر کی عیادت اور لومڑی کی ذکاوت

☆

علامہ ابن قیم جوزی اور حافظ ابونعیم امام شعبی سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوئی شیر بیمار ہوا تو اس کی عیادت کیلئے لومڑی کے علاوہ سارے ہی جانور پہنچے۔ لومڑی کو غائب دیکھ کر ایک بھیڑیئے نے شیر کے سامنے اس کی چغلی کی تو شیر نے کہا کہ جب وہ آئے تو ہمیں بتانا۔ جب لومڑی حاضر خدمت ہوئی تو بھیڑیئے نے بتلا دیا کہ یہی ہیں حضرت لومڑی صاحبہ جواب تک غائب تھیں۔ اس پر شیر نے ڈانٹ ڈپٹ کی اور تنبیہ کے ساتھ ساتھ جواب بھی طلب کیا تو لومڑی نے جواب میں عرض کیا کہ حضرت والا میں آپ کے واسطے دوا ڈھونڈھ رہی تھی۔ شیر نے کہا تو تمہیں کیا ملا؟ اس نے بتایا کہ بھیڑیئے کی پنڈلی میں ایک دانہ کے بقدر چیز ہوتی ہے وہ آپ کیلئے فائدہ مند ہوگی اور بہتر ہے کہ اسے آپ خود نکالیں۔ شیر نے یہ سنتے ہی فوراً اپنا پنجہ بھیڑیئے کی پنڈلی پر گاڑ دیا اور اسے لہولہان کر دیا۔ اتنے میں لومڑی چپکے سے وہاں کھسک گئی۔ اس کے بعد بھیڑیا اس لومڑی کے پاس سے گزرا۔ خون اب بھی اسکی ٹانگ سے بہہ رہا تھا تو لومڑی نے اس سے طنزیہ انداز میں کہا۔ اے سرخ موزے والے! بادشاہوں کے پاس جب بیٹھا کرو تو غور کیا کرو کہ تمہارے سر اور دماغ سے کیا چیز نکل رہی ہے؟

ابونعیم کہتے ہیں امام شعبی کا مقصد اس واقعہ کو بیان کرنے سے صرف مثال دینا ہے اور لوگوں کو تنبیہ کرنا ہے۔ نیز زبان پر کنٹرول رکھنے، اخلاق کو درست اور آراستہ اور ہر ممکن اسکی تادیب پر تاکید کرنا اور زور دینا ہے۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا۔۔۔!

حماقتوں کے اندھیرے یا واقعات کی روشنی میں!؟

☆

ابن جوزی اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں کہ اصمعی سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی حج کرنے گیا اور سب لوگوں سے پہلے ہی مکہ میں داخل ہوا اور کعبہ کے غلاف سے چمٹ گیا اور کہنے لگا: یا اللہ اس سے پہلے کہ لوگوں کا اژدھام ہو جائے، میری مغفرت کردے۔

اصمعی سے ہی مروی ہے کہ قریش کی ایک قوم اپنی زمین دیکھنے نکلی اور ان کے ساتھ بنی غفار قبیلے کا ایک شخص بھی ہولیا۔ اچانک سخت آندھی چلی۔ آندھی اتنی زور کی تھی کہ یہ لوگ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ پھر یہ سب بچ گئے۔ چنانچہ شکرانے کے طور پر ہر ایک آدمی نے اپنا ایک ایک غلام آزاد کردیا۔ بنو غفار قبیلے کا یہ دیہاتی کہنے لگا: یا اللہ! میرا تو کوئی غلام نہیں جسے آزاد کروں، لہٰذا تیری رضا کیلئے اپنی بیوی کو طلاق دیکر آزاد کرتا ہوں۔

ایک دن ابن جصاص کا غلام اس کے پاس ایک چوزہ لایا تو ابوعبد کہنے لگا: اس چوڑے کی طرف دیکھو، یہ اپنی ماں سے کتنا مشابہ ہے۔ پھر کہنے لگا کہ اس کی ماں مذکر ہے یا مونث؟

ایک دن ابن جصاص کا بخار ہو گیا۔ اس سے پوچھا گیا: کیسا محسوس کر رہے ہو؟ تو جواب دیا! ساری دنیا گرم ہے۔

ابن جوزی کے مطابق مشہور مورخ اور مصنف معانی نے بتایا کہ ایک معزز شخص بغداد آیا اور اس نے اپنے والد کو خیرت کی اطلاع دینے کے لئے خط بھیجنا چاہا تو وہاں کوئی خط لے جانے والا نہیں ملا۔ یہ شخص خود ہی واپس گیا اور اپنا خط والد کے حوالے کرتے ہوئے اسے کہا کہ: ''میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ آپ کو میرے پہنچنے کی اطلاع دیر سے ملے۔ چونکہ خط لانے والا کوئی نہ ملا اس لئے میں خود ہی یہ خط لے کر آپ کے پاس آ گیا''۔

یہ اگلے زمانے کے بیوقوفوں کی حماقتیں ہیں۔ آج وقت بدل گیا ہے۔ 'جدیدیت' کا زمانہ ہے۔ 'ترقیوں' کا دور ہے۔ اس لئے آج کی حماقتیں بھی ترقیوں کی منزلیں طے کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئی ہیں جہاں شیخ العالمؒ کی چشم باطن نے چھ سو سال پہلے جھانک کر یہ فرمایا تھا!

''وےتھہ ہوکن ہندر گریزن۔ تیلہ مالہ آسی واندرراج''

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

حقوق

☆

کئی رہنماؤں نے یوم انسانی حقوق کے موقعے پر کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف مظاہرے کئے، دھرنے دئے اور ریلیوں کا انعقاد ہوا۔ اتنا سب کچھ ہوا مگر میں پھر بھی سمجھ نہیں پایا کہ آیا یہ مظاہرے اِنسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر کئے گئے یا کہ سبب اور کچھ تھا! کیونکہ مجھے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر انسانوں کے حقوق ہیں کیا!۔۔۔۔۔۔ یہ حقوق دیتا کون ہیں اور اِن کے خزانے ہیں کہاں !؟ کئی بازاروں کے چکر لگائے۔ کئی دکانوں سے دریافت کیا۔ کئی تاجروں سے رابطہ بڑھایا۔ کہ بھائی، تمہارے پاس ایسے حقوق ہوں تو میں خریدنا چاہتا ہوں۔ مگر ہر جگہ سے حقوق تو نہ ملے البتہ مایوسی ملی۔ ہر شخص نے کہا کہ یہ مال ھمارے پاس دستیاب نہیں ہے۔ پھر ایک واقف کار نے میری بے چینی دیکھی تو بے چارے کو رحم آیا۔ اُس نے کہا کہ اس مال کو سرکار نے اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے کیونکہ یہ بہت اونچے داموں پر بلیک میں فروخت ہو رہا تھا اور اسے ارباب اقتدار اور بڑے بڑے تاجر ہی خرید پاتے تھے۔ چنانچہ عوامی سرکار نے غریبوں کی فلاح و بہبود اور کمزور طبقوں تک یہ مال پہنچانے کی خاطر اس پر کنٹرول کرلیا اور اب یہ مال حقوق راشن ٹکٹوں پر تقسیم ہو رہا ہے تاہم اس پر سبسڈی ختم کر دی گئی ہے اور جامہ تلاشی کے عوض دو حقوق یعنی سڑک پر چلنے اور دیکھنے کے حقوق، اندھا دُھند لاٹھی چارج پر جلوس نکالنے اور

مظاہرے کرنے کے حقوق، موٹی رقم کے ہدیئے پر سرکاری ملازمت کے حقوق، دو سوروپے کی فیس پر اندھیرے میں رہنے کے حقوق، کیونکہ بجلی کی بھاری مقدار انڈوکیشن سنٹروں کو سپلائی ہورہی ہے۔(ان کی کرنٹ میں وولٹیج کی کمی مُلکی مفادات کے لئے نقصان دِہ قرار دی گئی ہے)۔ دھکا دھکی کے عوض وزیروں سے ملاقات کے حقوق، اور وغیرہ وغیرہ پر وغیرہ وغیرہ کے حقوق۔ اس واقف کار کے مطابق اپنے یہاں حقوق تو وافر مقدار میں دستیاب ہیں تاہم انسان بے چارے ہی پامال ہورہے ہیں۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا۔۔۔۔۔۔!

چائے کی مٹھاس

☆

اپنے یہاں اکثر سرکاری کرمچاریوں کو رشوت کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ ان کا ضمیر، اِن کی غیرت، اِن کی حیا، اِن کے اخلاق، ان کا علم، اِن کی معاشرت، انکے رشتے، اِن کی دوستی، اِن کا لحاظ اور اِن کا وغیرہ وغیرہ یعنی سب کا سب اور تمام کا تمام ''چائے، چائے، چائے'' کی ''مٹھاس'' میں ایسا تحلیل ہو چکا ہے کہ لگتا ہے ایسے ہی آدمیوں کو نگاہ میں رکھ کر ڈارون نے اِنسان کا نسب بندروں سے ملا دیا ہوگا کیونکہ جانور بھی حیا اور اخلاق کے تکلّفات میں نہیں پڑتے۔

جونہی کوئی سائل کسی دفتر میں قدم رکھنے کا چیلنج قبول کر لیتا ہے تو نہی کرمچاریوں کی کرسیوں سے ''چائے، چائے، چائے'' کی ایسی آوازیں اُبھر آتی ہیں جیسے ہم سرکاری دفتر میں نہیں ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے ہیں۔ نہ جانے کریانہ فروش قبیلے کی اکثریت ہی سرکاری دفتروں میں بھرتی کیسے ہوگئی!؟ اکیسویں صدی کے دخول پر ترقی کا مارچ اتنا تیز تر ہوا ہے کہ مانگنے کی حد سائل کی جیب تک بڑھا دی گئی ہے۔ اگر سائل نے اپنے ہاتھ (اپنے) جیب میں ڈالنے میں تھوڑی سی تاخیر برتی تو پھر دفتری بابو کا ہاتھ خود ہی یہ ذمہ داری بھی سنبھال لیتا ہے مشاہدے کی بات ہے کہ اکثر اوقات اس کھینچا تانی میں سائل کا حلیہ مجنون کے موافق بنا دیا جاتا ہے۔

چونکہ ہم بھی ایسے ''شب وخون'' کے ایک دو بار نہیں، کئی بار نہیں بلکہ بار بار

شکار ہوئے ہیں اور کئی قیمتی واسکٹوں اور نفیس قمیضوں کا بلیدان دے چکے ہیں اس لئے تجربے کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ بلیاں ویجی ٹیرین نہیں بن سکتیں بلکہ نوچنا ان کی فطرت میں ہے۔ اِن کو پنجروں میں بند کر کے بیرون ریاست برآمد کرنا ہی عام لوگوں کے مفاد میں بہتر ہوگا۔

ہمارے ایک دوست ہیں۔ وہ سرکاری کرمچاری کی موت پر اُس کے جنازے میں تب تک شریک نہیں ہوتے جب تک یہ اطمینان نہ کرلیں کہ وہ کورپٹ نہیں تھا۔ ہمارے یہ دوست فرماتے ہیں کہ آدم خود سے بچا جا سکتا ہے مگر رشوت خور سے نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مچھر اور رشوت خور کی خصلت یکساں ہوتی ہے۔ دونوں خون چوستے ہیں۔ ہاتھی کے حملے سے بچا جا سکتا ہے مگر مچھر کے حملے سے نہیں۔

راوی نے روایت کی کہ حال ہی میں ایک شخص نے ایک دفتری بابو کی طرف مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ جب دفتری بابو نے اپنی طرف بڑھنے والا ہاتھ خالی دیکھا تو اپنا ہاتھ بھی آگے نہیں کیا۔ مصافحہ والا چونکہ نئے زمانے کی صبح وشام سے ناواقف تھا، اس لئے تعجب میں پڑ گیا اور اس نے دفتری بابو سے پوچھا: ''آپ نے محترم ہاتھ کیوں روک لیا؟''

جس پر دفتری بابو بولے! ''ہم کوئی کام مفت میں نہیں کرتے''

یہ رشوت لینے والے چاہیے اپنے مکروہ چہروں پر ہر روز نت نئے بلیڈ آزماتے رہیں اور اپنی کھال میں چکنائی لانے کے نت نئے میک اپ کراتے رہیں، اِن کے چہروں سے وہ ظلمت دور نہیں ہوسکتی جو رشوت نے اُن پر چڑھادی ہے۔ آپ

اِن لوگوں کے چہروں کو سرسری طور نہیں، ذرا کچھ منٹ غور سے دیکھیں، ان لوگوں کے چہروں کی شبیہہ اس مخلوق کی مانند نظر آئے گی جس کے نام کا تذکرہ کتاب کی زینت کیلئے بھی مضر ہے۔ محشر میں راشی ملازم بڑے 'تاون زدوں' کیساتھ پوری مخلوق کے سامنے رسوا ہونگے اور اس دنیا میں بھی اُن کیلئے 'تاون ہی تاون' ہے۔ وہ لاکھ گارے اور اینٹوں کے اونچے اونچے مکانات کی تعمیر کریں، کاروں میں گھومیں۔ جلیں گے اور مریں گے بھی نہیں ایک روز۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا!

خود کشیاں

☆

ایک بار کوئی چیز واقع ہو جائے تو انہونی یا انوکھی کہلائی جاتی ہے۔ دوسری بار یہی چیز دہرائی جائے تو تشویش بن جاتی ہے۔ تیسری بار ہو جائے تو معمول بن جاتی ہے۔ پھر چوتھی بار ہو جائے تو عادت بن جاتی ہے۔ پانچویں بار ہو جائے تو نشہ کہلائی جاتی ہے اور بار بار ہو جائے تو فیشن بن جاتی ہے۔

لگتا ہے کہ یہی حال اب ''خود کشیوں'' کا ہو گیا ہے۔ اخباری ''کومینڑیوں'' کے مطابق اس پاگل پن کی شرح ''ایک دن میں تین'' تک پہنچ گئی ہے۔ اطلاعات کے مطابق اس معاملے میں صنف نازک نے ذرا زیادہ ہی عجلت بازی کا مظاہرہ شروع کر دیا ہے گویا ''لیڈیز فرسٹ'' کی ''اخلاقی حدود'' میں صنف کرخت نے صنف نازک کو موت کے میدان میں بھی ''آگے کر دیا ہے''۔ جیسا کہ خبروں سے ظاہر ہے کہ کوئی عشق میں ناکامی پر اپنے آپ کو مار رہا ہے کسی کا ماں سے جھگڑا ہوتا ہے تو دوسری دنیا کی ''راہ'' لے رہا ہے۔ تیسرے یا تیسری کو نہ عشق کی ناکامی ہے اور نہ ماں سے جھگڑا ہے، پھر بھی زہر نوش فرما رہا ہے یا فرما رہی ہے۔ کوئی امتحان میں ناکام ہوتا ہے تو اپنی ناقابلیت پر آنسو بہانے کے بجائے ماں باپ کو رُلانے کا پروگرام بناتا ہے اور ''یا شاہ پادشاہ'' کا فلک شگاف نعرہ لگا کر دریا میں کود رہا ہے۔ بہر حال۔ مرنے کیلئے نئے نئے سٹائیل آزمائے جا رہے ہیں۔ گویا ہم بھی کسی سے کم نہیں۔۔۔!

خودکشیوں میں خاصا ریکارڈ شادی شدہ عورتیں بنانے لگی ہیں۔ اوران میں بھی زیادہ تعداد ان ''گرہستنوں'' کی بتائی جاتی ہے جنہوں نے محض اپنے میاں کو ''سبق سکھانے'' کیلئے اپنی روح کا رشتہ (اپنے) جسم سے توڑ دیا۔۔ اللہ خیر کرے۔

اس بات سے انکار نہیں کہ کبھی معاشی بدحالیاں، سماجی ظلم، گھریلو جھگڑے اور بدمزاجیوں کا ماحول ایک انسان کو اس حد تک تنگ اور عاجز بنا دیتے ہیں کہ ان سب چیزوں سے چھٹکارا پانے کیلئے اسے موت ہی آسان راستہ نظر آتا ہے۔ مگر یہ بات صرف اور صرف ان افراد پر صادق آتی ہے جو دین سے دور ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا اللہ پر بھی بھروسہ نہیں ہوتا ہے۔ دین سے قربت انسان کو باہمت بنا دیتی ہے اور باہمت انسان دشواریوں کو ایڈونچر کی طرح قبول کرلیتا ہے اور گھبرانے کے بجائے مشکلات سے لذت لیتا ہے۔

بہرحال، آئیندہ کوئی خودکشی کا ''شغل'' اختیار کرنے کا خیال رکھتا ہو تو دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہم سے ملتا جائے۔

تب تک، اپنا خیال رکھئے گا۔۔۔!

ڈیر ڈیڈی

☆

کئی ماہ سے 'ٹرائی' کرتا رہا کہ آپ کو ایک لیٹر بھیج دوں مگر میرا 'دماغی پیچ' چونکہ آپ نے انگریزی مزاج کے موافق بنایا ہے اس لئے انگریزی مزاج سے مسلم باپ کو کیسے مخاطب کیا جائے یہ معمہ حل ہی نہیں ہو پایا۔ آپ تو اس بات سے واقف ہی ہوں گے کہ انگریزی میں وقت کی مناسبت سے 'سلام' ہوتی ہے اس لئے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ کونسا 'سلام' آپ کے نام لکھ دوں۔ اگر 'گڈ مارننگ' لکھ لیا تو کیا پتہ آپ کو دوپہر کے وقت میرا لیٹر مل جائے۔ اب اگر 'گڈ آفٹر نون' سے لیٹر کی ابتداء کرتا تو یہ بھی ممکن ہے کہ لیٹر آپ کو شام کے وقت مل جائے۔ اب اگر گڈ ایوننگ لکھ لیتا تو کوئی ضمانت نہ تھی کہ یہ خط آپ کو شام ہی کے وقت ملے۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ اب انگریزی میں 'ہٹ اینڈ ٹرائیل' کا سہارا لیکر 'گڈ آفٹر نون' کا سلام ہی آزما لیتا تو کیا پتہ کہ خط موصول ہونے سے پہلے کوئی غم کی خبر آپ کو مل گئی ہوتی تو بھلا کیسے آپ کا آفٹر نون 'گڈ' ہو پاتا۔ بجائے گڈ کے اس سے آپ کو irritation ہی ہو جاتی۔ پھر میں نے مناسب یہی خیال کیا کہ کوئی سلام ہی نہ لکھوں۔ ویسے بھی جب ہم یہاں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو 'ہائی' یا 'ہیلو' کہتے ہیں۔ مگر میں آپ کو اس وجہ سے 'ہائی' نہیں لکھ پایا کیونکہ کشمیر میں 'ہائی' کسی نقصان یا خسارے پر ہی زبان سے جاری ہوتا ہے اور 'ہیلو' کہنا مجھے خود بھی پسند نہیں کیونکہ کیسے ایک بیٹا اپنے باپ کو 'Hell,o' کہہ سکتا

ہے۔۔!

In Fact 'سلام' کے اس کنفوژن میں بہت ٹایم چلا گیا اور 'انفارمیشن ٹیکنالوجی' کے اس دور میں لیٹر پر اتنا وقت بہت زیادہ ہوتا ہے۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا۔۔!

جھوٹ

☆

جس فیشن کو لوگ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، وہ جھوٹ اور مکاری ہے۔ سیاسی لیڈروں سے لے کر ماہی گیروں تک اور چوکیداروں سے لیکر نمبرداروں تک کوئی جھوٹ کے فیشن کو اپنے سے جُدا کرنے پر تیار نہیں۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک صاحب ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو دینے کے لئے جب ایک دفتر میں گیا۔ تو انٹرویو لینے والے آفیسر نے اُس سے پوچھا ''چونکہ اس دفتر میں صفائی کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے تو کیا آپ نے یہاں داخل ہونے سے قبل باہر کے پائیدان پر اپنے جوتے صاف کیئے؟''۔ اس صاحب نے فوراً جواب دیا۔ جناب میں نے اپنے جوتے پائیدان پر پوری طرح صاف کیئے۔ اس پر وہ افسر بولا۔ ''اس دفتر میں اُس شخص کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جو جھوٹ بولتا ہو۔ آپکی اطلاع کے لئے یہ عرض ہے کہ اس دفتر میں کوئی پائیدان ہے ہی نہیں''۔ انٹرویو کی بات چھڑ گئی ہے تو یہ بات عرض کروں کہ اپنے یہاں انٹرویو محض رسم بن کے رہ گیا ہے۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ بھرتی وہی اُمیدوار ہوتے ہیں۔ جن کو بڑے لوگوں کا آشیرواد حاصل ہو۔ میں نے سُنا ہے کہ ''بڑے لوگ'' بڑے ہی رحم پرور بھی ہوتے ہیں۔ ایک دن ایک بھکاری ایسے ہی ''ایک بڑے آدمی'' کے پاس بھیک مانگنے گیا۔ ''بڑے آدمی'' نے بھکاری سے کہا کہ اگر تم مجھے یہ بتا دو گے کہ میری دو آنکھوں میں سے کون سی آنکھ نقلی ہے تو میں تمہیں دس

روپے دوں گا۔ بھکاری نے اُس کی دونوں آنکھوں میں جھانکا اور بولا جناب! آپ کی دایئں آنکھ نقلی ہے۔" بڑے آدمی نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر بھکاری کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا: مگر تمہیں میری دایئں آنکھ کے نقلی ہونے کا پتہ کیسے چل گیا؟ جس پر بھکاری نے کہا۔

"جناب مجھے رحم کی جھلک اسی آنکھ میں نظر آئی۔"!

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا۔۔!

بے پردہ یا بے پروا

☆

تُو جو بھی ہے، تجھ کو میرا اسلام پہنچے۔!

''یوں نہ مُرجھا کہ مجھے خود پر بھروسہ نہ رہے''

''پچھلے موسم میں تیرے ساتھ کھلا ہوں میں بھی''

اُمید ہے کہ تم خیریت سے نہیں ہوگی۔ کیونکہ جو عورت بے پردہ ہو جاتی ہے وہ بے پروا بھی ہو جاتی ہے اور بے پروا عورت بے وفا بھی ہوتی ہے اور نتیجہ یہ کہ خیریت سے بھی نہیں ہوتی۔ وفا سیکھنا چاہتی ہو تو پھول سے سیکھو جو شاخ سے جُدا ہو کر مُرجھا جاتا ہے!

تم نے نقاب اُلٹ دی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ ہی تم نے معاشرتی اقدار کو بھی پامال کیا، ممتا کے پاکیزہ جذبے کی بھی توہین کی اور نسوانیت کی بھی تذلیل کی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ اب عریانیت کے بڑے ترجمان اور بے حیائیوں کے جانِ جاناں ''مغرب'' میں تمہیں 'Bed Toys' یعنی 'کھلونا بستر کا' کہا جانے لگا ہے۔ یاد رکھ! عورت شیشے کی مانند ہے اور مرد پتھر جیسا۔ شیشہ پتھر پر پڑے یا پتھر شیشہ پر پڑے، دونوں حالتوں میں شیشہ ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ عورت اور عورت میں بھی بہت فرق ہوتا ہے گو کہ نام یکساں ہی ہو۔ بالکل ایک گلاس کی طرح۔ جو سیدھا رہے یا الٹا، اس کے نام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر سیدھا رہے تو پانی پیا جا سکتا

ہے۔ اُلٹا رہے تو اس کا ہونا بے معنی بن جاتا ہے۔

اے میری قوم کی بیٹی! یاد رکھو! جسے اللہ پناہ نہیں دیتا۔ اُس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی یاد رکھ! جس طرح ایک کائیر کی سہاگن بننے کے بجائے ایک بہادر کی ودھوا بننا بہتر ہے اسی طرح ''فارورڈ'' بے حیا کے بجائے ''بیک وارڈ'' شریف بننے میں ہی عزت اور وقار ہے۔

پہاڑ اپنی جگہ سے آگے اور پیچھے جائیں گے۔ مائیں اپنے بیٹوں کو پہچاننے سے انکار کریں گی۔ مگر میں اپنے اس قول سے نہیں پھر سکتا کہ جب تو سدھرنے پر آتی ہے تو پورے معاشرے کو سکون واطمینان کے گہنوں سے مزین کر لیتی ہے۔

روشنی کی ٹمٹماہٹ سے تو اندھرا ہی پھیلتا ہے، اس لئے یا تو تقاضوں کے مطابق پردہ داری کر، ورنہ ایک عضو کو چھپا لیا اور دوسرے کی نمائیش شروع کر دی، یہ تو ایسا ہوا کہ انسان بارش سے بھاگ کر پرنالہ کے نیچے کھڑا ہو جائے۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

﴿روزہ، عید اور سیاست﴾

☆

یہ انسان اب اتنا خودغرض اور گھٹیا بن رہا ہے کہ اُس نے ماہ رمضان کو بھی Politicise اور عید کے تہوار کو Commercialise کرنا شروع کردیا ہے۔ گذشتہ روزوں کے ایّام اور پھر عید پر ایسے ہی واقعات کا بھرپور مشاہدہ ہوا۔

ایک سیاسی لیڈر دوسرے سیاسی لیڈروں کو ''افطار پارٹی'' پر بلا رہا ہے اور وہاں کوئی دینی تبلیغ یا روزوں کی فضیلت بیان نہیں ہورہی ہے بلکہ مختلف مذاہب کے لوگ کھڑے ہوکر گلاسوں کو پکڑے ہوئے ہیں یا میز کرسیوں پر کھانا کھایا اور کھلایا جارہا ہے اور فوٹو کھنچوائے جارہے ہیں اور پھر اخبار والے بے چارے پیٹ کے تقاضوں سے مجبور اِن تصویروں کو اخباروں میں چھاپتے رہتے ہیں۔

ارے میرے بھائی! کیا تمہیں پتہ ہے کہ تم لوگ اپنی اِس لاعلمی اور دین سے بے خبری میں اسلام کو کتنا زک پہنچا رہے ہیں؟۔ رمضان روزوں کا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنا رشتہ مضبوط اور مستحکم بنانے کا موقع ہے۔ انکساری اور عاجزی اور ڈبڈباتی آنکھوں سے استغفار کرنے کے دِن ہیں۔ رمضان کا مہینہ سیاسی سامان بنانے کا وسیلہ نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ دریاؤں نے بھی جان لیا کہ ہمیں سمندر میں گرنا ہے مگر۔۔۔۔! ویری ناگ سے جہلم نکلتا ہے تو سیدھا سمندر میں جاتا ہے۔ مگر مسلمان ابھی تک یہ نہیں جان سکا کہ مجھے کہاں جانا ہے! اسلام میں ہر بات اور ہر چیز کے لئے

اصول متعین ہیں۔ اسی لئے تو اسے مکمل ضابطِ حیات کہا جاتا ہے۔ افطار کرنا ہو یا پانی پینا ہو تو اس کے اپنے آداب ہیں۔ کھڑے ہو کر پانی پینا جائیز ہی نہیں ہے خاص کر جب دعوت کی نسبت رمضان سے کئی گئی ہو۔ اور پھر کھانے وغیرہ کے تمام آداب کو اسلام مخالف طریقے پر اپنانا اور پھر اِس دعوت کو مقدس مہینہ کے تعلق سے جوڑنا غضب ہی کو دعوت دینا ہے۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا۔!

شیر کی تصویر کا شوق

☆

بتایا جاتا ہے کہ ایک امیر شخص کو اپنے بازو پر شیر کی تصویر بنوانے کا شوق ہوا۔ چنانچہ اِس شخص نے اس کام کے ماہر سے رابطہ قائیم کیا۔ ماہر اپنا ساز و سامان لئے جناب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ماہر نے جب رنگ بھرنے کے لئے اس شخص کے بازو میں سوئیاں چھبونا شروع کیں تو یہ شخص تلملا اٹھا اور ماہر سے پوچھا:

''ارے بابا کیا بنا رہے ہو؟''

ماہر نے کہا کہ جناب شیر کی دُم بنا رہا ہوں۔ یہ شخص بولا: ''بھائی دُم کو رہنے دو۔ آخر دُم کٹے شیر بھی تو ہوتے ہیں''۔ ماہر نے دُم چھوڑ کر ٹانگوں پر کام شروع کیا۔ تو امیر شخص کو پھر تکلیف ہوئی۔ پوچھا: ''اب کیا بنا رہے ہو؟''

ماہر نے کہا:۔ حضرت ٹانگیں بنا رہا ہوں۔ امیر شخص بولے:۔ ''ٹانگوں کو چھوڑو۔ آخر ٹانگوں کے بغیر بھی شیر ہوتے ہیں۔'' ماہر نے ٹانگیں چھوڑ کر پیٹ پر کام شروع کیا تو جناب پھر چلائے اور کہا: ''ارے تو نے تو مجھے مار دیا''۔

''ارے بھائی پیٹ کا نقشہ رہنے دو اور آگے کام شروع کرو۔'' مختصر یہ کہ پیٹ اور سر بھی نہ بن سکا اور امیر صاحب ''فارغ'' ہو گئے۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ جناب بس کچھ ایسی ہی مثال آج کے بہت سے مسلمانوں پر صادق آتی ہے۔ آج کے ایسے ہی مسلمان سے کہا جاتا ہے کہ داڑھی

کیوں نہیں رکھتے ؟ تو وہ کہتا ہے کہ صرف داڑھی دین تو نہیں ہے۔ اُسے کہا جاتا ہے کہ ٹخنوں کے نیچے پاجامہ کیوں لٹکا دیا تو وہ کہتا ہے کہ ایسا بالکل ضروری تو نہیں۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ نماز اور روزے ہی تو اسلام نہیں ہے اسلام اُس کے بغیر بھی بہت کچھ ہے۔

مانا نماز اور روزہ ہی اسلام نہیں ہے مگر نماز اور روزہ اسلام میں تو ہے۔ مانا داڑھی ہی دین نہیں ہے مگر داڑھی دین میں تو ہے۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا!

یاد ماضی عذاب ھے یا رب
کوئی چھین لے حافظ میرا

☆

اگلے وقتوں کی بات ہے۔ جب شادی بیاہ کے سلسلے میں لڑکے اور لڑکی والوں کے درمیان رشتہ طے کرنا ہوتا تھا تو درمیانہ دار یعنی ''منزم یوُر'' کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں وہ دو فریقوں کو ایک دوسرے کی معلومات فراہم کرتا تھا۔ اِن وقتوں میں جب ''منزِم یوَر'' لڑکی والوں کے ہاں کسی لڑکے کا رشتہ لے کر جاتا تھا تو لڑکے والے کے گھر کے متعلق کچھ اس طرح کی تفصیل بتایا کرتا تھا۔

''حضور! لڑکے کا نام عبداللہ ہے۔ والد ابو عبداللہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ والدہ کا نام بی بی مریم ہے۔ لڑکا اتنا شریف کہ کسی غیر لڑکی پر نظر پڑتے ہی پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے۔ نماز کا اتنا پابند ہے کہ مجال ہے کبھی کوئی نماز قضا ہوئی ہو۔ باپ اس سے بھی دو قدم آگے ہے۔ دیانتدار ایسا کہ عبداللہ جب تیسری جماعت میں پڑھتا تھا تو سکول کے گراؤنڈ سے دو چار کنکر اٹھا کر گھر لایا تھا تاکہ ان سے کھیل سکے۔ باپ نے سُنا تو اُس پر دِل کا دورہ پڑا۔ باپ کا کہنا تھا کہ عبداللہ آج سکول سے صرف کنکر اُٹھا کر لایا ہے کل سکول کی اینٹیں بھی چرا سکتا ہے۔ بیٹے نے باپ کی حالت دیکھی تو سہم گیا، کنکر واپس سکول میں چھوڑ دیئے۔ بی بی مریم ایسی خاتون کہ ہر بات پر بسم اللہ، الحمدللہ، جزاک اللہ، انشاءاللہ جیسے بابرکت کلمات ادا کرتی ہے۔ یہ گھر فرشتوں کا

مسکن لگتا ہے"

جب "منزم یوّر" لڑکے والوں کے گھر کسی لڑکی کا رِشتہ لے کر جاتا تھا تو بات کچھ اس طرح شروع کرتا تھا۔

"حضور! اللہ ہر ایک کو ایسی لڑکی نصیب میں دیدے۔ نام فاطمہ ہے۔ ہمسائیوں سے پوچھو تو کہیں گے کہ واللہ ہمیں آج تک معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں کوئی لڑکی بھی ہے۔ پردہ ایسا کہ چچیرے، ممیرے، مسیرے، اور پھپھیرے بھائیوں سے بھی حجاب ہے۔ قرآن مجید حفظ ہے۔ گھر کا سارا کام خود کرتی ہے ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ کھانا پکانا کوئی اُس سے سیکھے! فاطمہ کے ہاتھ کا کھانا جو کھاتا ہے انگلیاں تک چاٹ لیتا ہے!

اور جب آج کے اس زمانے میں "منزم یوُر" کسی لڑکے والے کے گھر کسی لڑکی کا رشتہ لے کر جاتا ہے تو اس طرح کی معلومات دیتا ہے۔

"لڑکی کا نام ڈریم گرل ہے۔ فیشن کوئی اُس سے سیکھئے۔ راستے سے گذرے گی تو شرطیں لگتی ہیں کہ اس نے کچھ پہنا بھی ہے کہ ننگی ہے۔ حسین ایسی کہ سڑک سے جب گذرتی ہے تو لوگوں کا پورا جلوس پیچھا کرتا ہے ٹریفک تک جام ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی پیچھا کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑتا ہے اور آنسو لانے والی گیس چھوڑنی پڑتی ہے۔ دلیر ایسی کہ چوراہے پر سگریٹ جلاتی ہے۔ کشمیری زبان اُس نے کبھی بولی ہی نہیں، کُتوں سے بھی انگریزی اور اُردو میں بات کرتی ہے۔ صحتمند ایسی کہ چار بار اغوا کی گئی مگر پھر بھی چہرے پر رونق

ہی رونق ہے"

اور لڑکے والوں کے متعلق آج کل "ممئزم یوّرز" کیا کہتا ہے۔ لو وہ بھی سُن لیجئے۔

"لڑکے کا دِل گردہ اتنا مظبوط ہے کہ جس دفتر میں کام کرتا ہے وہاں سے بجلی کے لیمپ تک چرا لیتا ہے۔ "کلرفُل" نام ہے۔ ذہین اتنا کہ کئی لڑکیوں کو ورغلا کر اُن کی آبرو لُٹانے میں کامیاب ہوا۔ باپ تو دھاندلیوں اور لوٹ مار میں اتنا ماہر خیال کیا جاتا ہے کہ جس علاقے میں اُس کی تبدیلی ہوتی ہے وہاں سے چور اور ڈاکو اپنا ڈیرہ اُٹھا لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمارا "بادشاہ" آگیا اب ہمارا یہاں کیا کام! نام تو "رَسُل ماگرے" تھا لیکن اب "رَسَل مائیگ رائے رکھا ہے۔ بیوی کا نام "فزی" تھا لیکن اب "فوزیہ" ہو گیا ہے۔ فوزیہ اتنی پڑھی لکھی ہے کہ کمیونسٹ بن گئی۔ گھر میں کوئی فرسودہ نشان باقی رہنے نہیں دیا گیا ہے۔ رَسَل کی بوڑھی ماں تھی ٹار چر کر کے اُس سے نجات پائی گئی۔ لیکن ایک پُرانا نشان باقی بچا ہے وہ کم بخت رسل کا باپ ہے۔ جیسے اب حیات پیا ہے کم بخت نے! ۔ بیٹے نے مارنے کے کتنے جتن کئے مگر وہ ہے کہ مرنے پر آمادہ ہی نہیں ۔ بیٹے نے سمجھایا بھی کہ بابا اب تمہارا زندہ رہنا ہمیں اپنی برادری میں غریبی اور مفلسی کے دنوں کی یاد دلاتا ہے، خدا کے لیے جنت کی راہ کی جانب قدم بڑھائیے اور جنت میں آج تک کوئی زندہ اِنسان نہیں پہونچا ہے وہاں مر کر ہی جایا جا سکتا ہے۔

بہرحال، آپ اپنا خیال رکھئے گا!

کشمیر میں درآمدات

☆

یوں تو درآمدات اور برآمدات کا عمل اگلے وقتوں سے جاری ہے اور یہ سلسلہ ابدتک جاری رہیگا۔ کوئی بھی ملک ہو اور کسی بھی ملک کی کوئی بھی ریاست ہو کوئی نہ کوئی چیز درآمد ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی شے برآمد کی جاتی ہے۔ درآمد اور برآمد کے سلسلے کی یہ کہانی ہماری ریاست میں بھی دُہرائی جارہی ہے جبکہ کشمیر نے درآمدات کے معاملے میں عالمی ریکاڈ قائم کرلیا ہے۔ اپنے یہاں انڈے سے لیکر ڈنڈے تک ہر چیز درآمد ہوتی ہے۔ سرمایہ دار لوگ انڈے کھاتے ہیں اور غریب عوام ڈنڈے۔ یہاں ذلالت بھی درآمد ہوتی ہے اور خجالت بھی۔ اور اب قومی پریس نے سفید جھوٹ بھی درآمد کرنا شروع کردیا ہے۔ اپنی اس وادی میں آپ دیکھیں گے کہ اگر ایک طرف سجاوٹ درآمد ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی گراوٹ اور ملاوٹ کی وباء بھی درآمد ہوتی ہے۔

میرا نظریہ ہے زندگی صبح سے شروع ہوتی ہے اور شام پر ختم ہوتی ہے اور رات کو صرف سانسوں کا اُتار چڑھاؤ باقی رہتا ہے اور اگر اس حساب سے سوچا جائے تو ہماری پوری زندگی درآمدات کی بُنیاد پر قائم ہے۔ آپ صبح اُٹھتے ہیں تو دانتوں کو صاف کرنے کے لئے جو برش اور پیسٹ استعمال کرتے ہیں وہ بھی باہر کی ہوتی ہے۔ پھر آپ نہاتے ہیں تو صابن اور تولیہ کو استعمال میں لانا پڑتا ہے دونوں چیزیں یہاں کی نہیں ہوتیں۔ اُس کے بعد آپ کپڑے بھی باہر کے ہی پہنتے ہیں (بے شک ''بنگلہ

دیش''، ہی کیوں نہ ہوں)۔ پھر کھانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چائے، کھانڈ، نمک، مکھن، انڈے، چاول، سبزی، تیل، مصالحہ جات، گوشت، پنیر، دودھ سب چیزیں باہر سے لائی گئی ہوتی ہیں۔ اس حد تک پھر بھی ٹھیک تھا۔ لیکن اب لوگوں نے بیویوں کو بھی درآمد کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر سرینگر جموں شاہراہ زیادہ عرصے کے لئے بند رہی تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد کنواری ہی مر جائیگی۔ اب اگر یہاں کوئی مکان تعمیر کرنا ہو یا مکان کی مرمت کرنی ہو تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے لئے بھی درآمدات پر دارومدار ہے۔ مستری ہو یا ترکھان باہر کا ہے۔ یہاں باہر کے مزدوروں کی تعداد اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ یہاں کے پُشتی باشندے اقلیت میں نظر آنے لگے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اب یہاں گھروں میں زبان بھی باہر ہی کی بولی جاتی ہے۔ چوں کہ اس زبان پر عام لوگوں کو پوری دسترس حاصل نہیں ہے اس لئے کچھ الفاظ باہر کے اور کچھ اندر کے استعمال ہو رہے ہیں۔ اس طرح آج کل جو زبان یہاں گھروں میں بولی جا رہی ہے وہ ''اندر باہر'' کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔

سُنا ہے حکومت نے درآمدات میں اضافے کے اس عمل پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ کشمیر نے بہت ترقی کر لی ہے۔ حکومت نے کہا ہے کہ جب بازار میں دُودھ آسانی سے ملتا ہو تو گھر میں گائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح جب باہر سے ہر چیز لائی جا رہی ہے تو کشمیر میں خود کفالت کے بارے میں سوچنا بے وقوفی ہے۔ سوچنا اگر ہے تو کیوں نہ اقتدار کو زیادہ مضبوطی سے تھامنے کے متعلق سوچا جائے۔ سیاسی لیڈروں نے یہ بھی دھمکی دی ہے کہ اگر کسی نے اُن کے نظریے کے خلاف سوچنا

شروع کیا تو وہ ''سوچ'' بھی درآمد کریں گے تاکہ یہاں کوئی اپنے دماغ سے نہ سوچ سکے۔

معلوم ہوا ہے کہ نانبائیوں نے کشمیر میں جو لوٹ مچادی ہے اُس کا توڑ کرنے کے لئے حکومت ''نان'' بنانیوالے ''بھائیوں'' کو بھی باہر سے درآمد کریگی اور یہ ''نان بھائی'' یہاں کے نانبائیوں سے براہ راست دو دو ہاتھ کریں گے۔

بہرحال، اپنا خیال رکھئے گا!

مُرغی

☆

ڈاکٹر فاروق نے کھنموہ میں ایک کارخانے کی افتتاحی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مولوی فاروق میرے سامنے محض ایک مرغی ہے۔ ''مولوی فاروق، ڈاکٹر فاروق کی طرف سے ایسا خطاب نوازنے پر بالکل ناخوش نہیں ہوئے اور اُنہوں نے ''ککڑوں ککڑوں'' کر کے اپنے سارے چوزوں کو بلا کر ہنگامی اجلاس منعقد کیا اور کہا کہ ''ہم مرغیاں ہی سہی، پر دوسروں کے گھروں میں انڈے کیوں دیں!''۔ چوزوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور فریاد کی۔ ''فاروق صاحب! ہم نے جنتا پارٹی میں بھی ایکبار انڈے دئے تھے پر کیا ملا؟ پھر آپ کی ہدایت پر نیشنل کانفرنس کے لیڈر کے گھر میں انڈے دیتے رہے، پر ہمیں کیا ملا۔؟ بہتر تو یہی ہے کہ ہم اپنی فیملی پلاننگ کرالیں تا کہ کسی کو ہمارے انڈوں کی لالچ نہ رہے۔ اور ہم استحصال سے بچ سکیں۔'' اس پر مولوی فاروق کچھ سوچ میں پڑ گئے اور پھر بڑے ہی فلسفیانہ انداز میں گویا ہوئے۔ ''نادانو۔ تم اگر انڈے دینے سے محروم ہو گئے تو حکومت گوشت کی قلت کا بہانہ بنا کر تم سب کو نگل جائے گی۔'' مولوی فاروق کی اس بات پر تمام چوزے عش عش کر اُٹھے اور اپنے لیڈر کی دانائی کی تعریف کی۔ پھر ایک دم کسی نے نعرہ بلند کیا۔ ''لیڈر ہمارا''؟ مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیوں کہ اجلاس والے کمرے کے باہر گولیوں کی گڑ گڑاہٹ تیز ہو گئی تھی۔

ادھر جب ڈاکٹر فاروق نے مولوی فاروق کے اس اجلاس کی کاروائی کے بارے میں سُنا تو اُنہوں نے فوراً اخبار والوں کو بلایا۔ اخبار والے جب ڈاکٹر فاروق کے پاس پہنچ گئے تو ڈاکٹر فاروق بڑے خشمناک موڈ میں تھے۔ اُنہوں نے اخبار والوں سے کہا: ''میں تم کو بانہال بار پھینک دوں گا۔'' اخبار والے حیرت میں پڑ گئے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا۔ تو اُنہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''جناب عالی! ہمارا قصور کیا ہے؟'' جس پر ڈاکٹر فاروق نے کہا: ''تم لوگ واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہو۔ میں نے مولوی فاروق کو مُرغا کہا اور تم نے مرغے کو مرغی بنا دیا!''۔ اس پر ایک اخبار والے نے ڈاکٹر صاحب سے کہا:۔ ''جناب عالی! آپ کو ہمیں بانہال بار پھینکنے کے لئے ایک بس کی ضرورت پڑے گی، چوں کہ وادی میں پہلے ہی ٹرانپورٹ کی شدید قلت ہے اس لئے شاید آپ کو بس دستیاب نہ ہو۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم خود پیدل چل کر اپنے آپ کو بانہال پار پہنچا دیں کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ بانہال پار کرنے کے بعد حکومت محض مرغی بن جاتی ہے۔''

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

خبروں کی دھلیز

☆

کچھ دن قبل پلوامہ کے ایک علاقے میں ایک دوشیزہ نے ایک بوڑھی عورت کا خون کر دیا۔

دروغ بر گردن راوی جس نے یہ اطلاع دی ہے کہ کئی سیاسی لیڈر آج کل اس دوشیزہ کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ان سیاسی لیڈروں کا خیال ہے کہ یہ دوشیزہ آئیندہ الیکشن میں بہت کام آسکتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک سیاسی پارٹی نے اس دوشیزہ کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کے لئے نائب صدر کا عہدہ دینے کی پیش کش کی ہے۔ راوی کا یہ بھی کہنا ہے کہ دوشیزہ نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ وہ اُسی پارٹی میں شامل ہوگی جس کے منشور میں بوڑھی عورتوں کو دوسری دنیا میں پہنچانے کا مقصد شامل ہو کیونکہ اس دوشیزہ کا خیال ہے کہ جہاں بوڑھے مردوں نے سیاست کو گندا کھیل بنا دیا ہے وہاں بوڑھی عورتوں نے اینٹ کے ایک ہی وار سے مرکر زندگی کو توہین آمیز بنا دیا ہے۔ یہ خبر قابل ذکر ہوگی کہ اس دوشیزہ نے اینٹ کے ایک ہی وار سے بوڑھی عورت کے جسم اور روح کا رشتہ توڑ دیا تھا۔

بونہ پورہ بٹہ مالو کی ایک لڑکی کا ایک لڑکے نے اغوا کرلیا:۔

بھائی جان۔ آج کے دور میں لڑکیاں اغوا نہیں ہوتیں بلکہ ''یہ بن پھیرے اور ہم تیرے'' کا معاملہ ہوتا ہے۔ فلموں نے ہمارے سماج کو نہایت ہی آلودہ بنا دیا ہے جو

کسر فلموں نے چھوڑ دی تھی وہ ٹیلی ویژن سے پیش ہونے والے مخش پروگراموں نے پوری کر دی۔ پیار کرنا اج کل ایک ایسا فیشن بن گیا ہے جس کے اثر میں ۱۲ سالہ بچہ بھی ہے اور ۶۲ سالہ بوڑھا بھی ہے۔

مشاہدے کی بات ہے کہ ایسے نوجوان جن کو تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے بھی نہیں ہوتے، پیار وہ ضرور کرتے ہیں۔ ایسی لڑکیاں جو ایک ہی کلاس میں کئی کئی سال فیل ہو جاتی ہیں مگر سر پر عشق کا بھوت ضرور سوار ہے۔ چند دن پہلے میں ستانے کی غرض سے میونسپل پارک گیا۔ میں پارک میں لیٹا تھا کہ اسی دوران ایک نوجوان جوڑا میرے نزدیک ہی آ کر بٹھ گیا۔ دونوں سمجھے میں محو خواب ہوں اور بے خوف ہو کر۔۔۔۔ بہرحال میرے کہنے کا مقصد ہے کہ یہاں بے شرمی، بے حیائی، فحاشی یہاں تک کہ عصمت دری اور عصمت فروشی کو بھی پیار ہی کہا جاتا ہے۔ اور پیار کے نام پر اکثر پیار کی نشانیاں نالیوں یا ویران راستوں پر کپڑوں میں لپٹی ہوئی ملتی ہیں۔

اُدھم پور میں ۴ا پولنگ بوتھوں پر دوبارہ ووٹنگ ہوگی۔

بھیا! بانہال پار کی بات ہے اپوزیشن کے اُمیدوار کو آسانی سے ہرا دینا ممکن نہیں۔ یہاں کی بات اور ہے۔ اپنے یہاں تو پولنگ سے پہلے ہی پورٹ فولیوز بانٹے جاتے ہیں۔

مسلم متحدہ محاذ کو جلسے کی اجازت نہیں ملی۔

جن دنوں میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اُن دنوں کا ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ ایک لڑکے نے ماسٹر جی سے کہا کہ ''سر! پاس''۔ ماسٹر جی نے اجازت نہیں

دی۔لڑکا بے چارہ تھوڑا سا بے چین تھا ماسٹر جی سے دوبارہ کہا: ''سر! پاس''۔ماسٹر جی بالکل اپنی سرکار جیسا تھا، بالکل نہیں مانا اور اجازت نہیں دی۔لڑکا بے چار کچھ زیادہ ہی بے چین ہو گیا، ماسٹر جی سے تیسری بار کہا: ''سر! پاس''۔ ماسٹر جی اپنی ضد پر قائم رہے۔ چنانچہ لڑکے نے کلاس میں ہی پیشاب کر دی۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

کسر فلموں نے چھوڑ دی تھی وہ ٹیلی ویژن سے پیش ہونے والے مخش پروگراموں نے پوری کر دی۔ پیار کرنا آج کل ایک ایسا فیشن بن گیا ہے جس کے اثر میں ۱۲ سالہ بچہ بھی ہے اور ۶۲ سالہ بوڑھا بھی ہے۔

مشاہدے کی بات ہے کہ ایسے نوجوان جن کو تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے بھی نہیں ہوتے، پیار وہ ضرور کرتے ہیں۔ ایسی لڑکیاں جو ایک ہی کلاس میں کئی کئی سال فیل ہو جاتی ہیں مگر سر پر عشق کا بھوت ضرور سوار ہے۔ چند دن پہلے میں ستانے کی غرض سے میونسپل پارک گیا۔ میں پارک میں لیٹا تھا کہ اسی دوران ایک نوجوان جوڑا میرے نزدیک ہی آ کر بٹھ گیا۔ دونوں سمجھے میں محو خواب ہوں اور بے خوف ہو کر۔۔۔۔ بہر حال میرے کہنے کا مقصد ہے کہ یہاں بے شرمی، بے حیائی، فحاشی یہاں تک کہ عصمت دری اور عصمت فروشی کو بھی پیار ہی کہا جاتا ہے۔ اور پیار کے نام پر اکثر پیار کی نشانیاں نالیوں یا ویران راستوں پر کپڑوں میں لپٹی ہوئی ملتی ہیں۔

اُدھم پور میں ۱۴ پولنگ بوتھوں پر دوبارہ ووٹنگ ہو گی۔

بھیا! بانہال پار کی بات ہے اپوزیشن کے اُمیدوار کو آسانی سے ہرا دینا ممکن نہیں۔ یہاں کی بات اور ہے۔ اپنے یہاں تو پولنگ سے پہلے ہی پورٹ فولیوز بانٹے جاتے ہیں۔

مسلم متحدہ محاذ کو جلسے کی اجازت نہیں ملی۔

جن دنوں میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اُن دنوں کا ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ ایک لڑکے نے ماسٹر جی سے کہا کہ "سر! پاس"۔ ماسٹر جی نے اجازت نہیں

دی۔لڑکا بے چارہ تھوڑا سا بے چین تھا ماسٹر جی سے دوبارہ کہا: ''سر! پاس''۔ ماسٹر جی بالکل اپنی سرکار جیسا تھا، بالکل نہیں مانا اور اجازت نہیں دی۔لڑکا بے چارہ کچھ زیادہ ہی بے چین ہو گیا، ماسٹر جی سے تیسری بار کہا: ''سر! پاس''۔ ماسٹر جی اپنی ضد پر قائم رہے۔ چنانچہ لڑکے نے کلاس میں ہی پیشاب کر دی۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

باتھ روم کا غازی

☆

زیادہ دن نہیں ہوئے، مجھے ایک خبر کی تصدیق کے لئے ایک منسٹر صاحب کو ٹیلی فون کرنا پڑا۔ منسٹر صاحب کے نمبر کا ڈائیل گھمایا۔ تو دوسری طرف آواز آئی: ''صاحب، باتھ روم میں ہیں۔'' آپ لوگوں سے اتنا عرض کرلوں کہ انگریز لوگ غسل خانے کو باتھ روم کہتے ہیں مگر انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اپنے یہاں کے وزیروں نے بیت الخلاء کو بھی باتھ روم کہنا شروع کر دیا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عام طور وہی لوگ وزیر بن جاتے ہیں جو نہانے کو زیادہ پسند نہیں کرتے اس لئے ان صاحبان نے بیت الخلاء کو باتھ روم کہنا شروع کر دیا ہے۔ بہرحال، میں نے وزیر موصوف کو ایک گھنٹے کے بعد دُوسری بار فون کیا۔ تو وہاں سے آواز آئی: ''صاحب، باتھ رُوم میں ہیں۔'' میں نے سوچا، شاید صاحب باتھ روم میں اپنی عمر بھر کی گندگی اور میل کو دھوتا رہا ہو۔ لیکن پھر فوراً ہی خیال آیا کہ یہ لوگ چوں کہ بیت الخلاء کو بھی باتھ روم کہنے کے عادی ہیں، اس لئے غالباً منسٹر موصوف کو شدید قبض ہوگا جس کے سبب وہ ایک گھنٹے سے باتھ روم سے باہر آنیکا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا، میں نے منسٹر صاحب کا نمبر تیسری مرتبہ گھما دیا۔ تو آواز آئی: ''صاحب، باتھ روم میں ہیں۔'' اگلے روز اتوار تھی میں نے سوچا چلو، کل ہی خبر کی تصدیق کراتے ہیں میں نے دُوسرے دن صبح کے ۱۱ بجے اسی منسٹر صاحب کے ٹیلی فون کا نمبر ملایا تو آواز آئی: ''صاحب باتھ روم میں ہیں۔'' میں نے دُوسری طرف رسیور اُٹھانے والے

سے کہا: "۴۸ گھنٹے باتھ روم میں رہنے والے اپنے "جانور صاحب" سے کہہ دینا کہ اس کی ضرورت وزارت سے زیادہ، چڑیا گھر میں ہے۔" اور میں نے فون رکھ دیا۔

تعجب اس بات کا ہے کہ آج کے دور میں جب کہ انسان خلاؤں میں محو پرواز ہے، ہمارا منسٹر بیت الخلاؤں میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ اسے خلائی تحقیق سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ وہ منسٹر "بیت الخلائی" بن گیا ہے۔

اپنے "بیت الخلاء" منسٹر صاحب کے متعلق ایک صحافی صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ منسٹر موصوف کو منسٹر بننے سے قبل گھر میں چوں کہ کوئی "باتھ روم" یعنی بیت الخلاء نہیں تھا اس لئے بے چارے کو صبح سویرے لمبی مسافت طے کر کے کسی سرکاری "باتھ روم" کو تلاش کرنا پڑتا تھا اور یہ اس کا معمول بن گیا تھا۔ ایک دن معمول کے مطابق یہ شخص جب صبح سویرے لمبی مسافت طے کرنے کے لے مخصوص جگہ پر پہنچا تو وہاں اسے معلوم ہوا کہ اس جگہ کل شام ہی میونسپلٹی والوں نے سرکاری بیت الخلاؤں کو ہٹا دیا تھا۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ اس بے چارے پر یہ خبر سُن کر کیسی بجلی گری ہوگی۔ چوں کہ مجبور تھا اس لئے بے چارہ دوسرے سرکاری "باتھ روم" کی تلاش میں نکلا۔ اس نے سوچا جب کولمبس امریکہ کو دریافت کر سکتا ہے اور داسکوڈی گاما کو ہندوستان مل سکتا ہے تو کیا میں سرکاری بیت الخلاء تلاش نہیں کر سکتا۔ بڑے جوش و خروش سے یہ شخص بیت الخلاء سر کرنے کی مُہم پر روانہ ہو گیا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسے بیت الخلاء تو نہ ملا مگر وزارت مل گئی!

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

دیا خاموش ہے لیکن ہمارا دل تو جلتا ہے چلے آئو۔ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

☆

سنا ہے میونسپلٹی کے جاگیرداروں نے ایک سرکیولر جاری کر دیا ہے جس کے تحت پرندوں کو وارننگ دی گئی ہے کہ وہ گھونسلوں کی صورت میں کھڑی کی گئیں تعمیرات کا سلسلہ بند کر دیں کیونکہ ان تعمیرات کے لئے میونسپلٹی سے پرندوں نے کوئی اجازت نامہ حاصل نہیں کیا ہے لہٰذ کشمیری قوم کی مایہ نازفورس جو خاکروبوں پر مشتمل ہے اور جس نے آج تک ہر محاذ پر فتح کے جھنڈے گاڑ کر دنیا میں کشمیر کا نام روشن کیا ہے اب پرندوں کے ان ناجایز تعمیرات پر دھاوا بول رہی ہے یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہمارے خاکروبوں کی فورس کا نام سن کر تو بلوچ رجمنٹ تک کانپ جاتی ہے بھلا یہ پرندے کس کھیت کی مولی ہیں چنانچہ اس سرکیولر کے سبب پرندوں میں تشویش پھیل گئی۔

پرندوں کے قریبی حلقوں سے معلوم ہوا ہے کہ پرندوں نے اس سنگین معاملے کے پیش نظر ایک خفیہ اجلاس بلایا تا کہ اس صورتحال کو زیر بحث لایا جا سکے پرندوں کے ذرائع کے مطابق اجلاس میں چیل، مینا، بلبل، چڑیا، کوئیل، ہُد ہُد وغیرہ نے شرکت کی تاہم اجلاس میں کسی آدمی کو شریک ہونے کی دعوت نہیں دی گئی کیونکہ پرندوں کے نزدیکی حلقوں کا کہنا ہے کہ آدمی کے متعلق پرندوں کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ

کہیں وہ کانگریس والوں کا ایجنٹ نہ ہو۔ کانگریس والے لوگوں پر الزام ہے کہ وہ
سمجھانے سے زیادہ ورغلانے میں مہارت رکھتے ہیں چونکہ پرندے اپنی برادری میں
کسی انتشار اور پھوٹ ڈالنے کے نظریئے کے شدید ترین مخالف ہیں اس لئے اجلاس
میں آدمی کو شریک نہیں کیا گیا۔ اجلاس کی صدارت مکرمی کوے نے کی اور چیف گیسٹ
محترمہ چیل تھی۔

کوے نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ گھونسلوں کے لئے میونسپلٹی سے
اجازت نامہ حاصل کرنے کے مقابلے میں جوئے شیر لانا کوئی کٹھن کام نہیں۔ اجازت
نامہ حاصل کرنے کے لئے بھاری رشوت کی ضرورت پڑے گی اور رشوت کی رقم چونکہ
چونچوں یا پنجوں میں نہیں بلکہ جیب میں رکھنی پڑتی ہے اور چونکہ جیب لباس میں بنائی
جاسکتی ہے اس لئے اجازت نامہ حاصل کرنیکا براہ راست تعلق لباس سے ہے۔ اِس
لحاظ سے پرندوں کو لباس پہننے کی بھی ضرورت پڑے گی۔ چونکہ لباس پہن کر ہم پروں کو
حرکت نہیں دے پائیں گے اس لئے ہماری اڑانیں بند ہونگیں اور ہمیں اپنی ٹانگوں کا
سہارا لے کر پیدل چلنے کی عادت ڈالنی ہوگی مگر اس میں مصیبت یہ ہے کہ رشوت کی
بنیاد پر آدمی نے اتنا سرمایہ حاصل کرلیا ہے کہ اس نے پیدل چلنے کی عادت ترک کر کے
کاروں اور بسوں میں سفر کرنا شروع کر دیا ہے۔ ادھر ارباب اقتدار بھی سڑکوں کو کشادہ
بنانے کی فکر کرنے کے بجائے اپنی کرسیوں کو بچانے میں مصروف ہیں کیونکہ ان کے
حریف ان کی ٹانگیں کھینچنے میں لگ گئے ہیں چنانچہ اِس کھینچا تانی میں سڑکوں پر ٹریفک کا
دباؤ بڑھ گیا ہے۔ دوسری طرف سڑکوں پر ڈرائیوروں کی اور ٹیکنگ کشمیر کا قومی کھیل

بن گیا ہے۔ اس کھیل کی نذر آج تک سینکڑوں بھاری بھر کم لوگ ہو گئے اس لئے اگر ہم نے پیدل چلنا شروع کر دیا تو ہماری پوری نسل کچل دی جائے گی۔ میں آخر کار اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اجازت نامہ حاصل کرنیکا تعلق ہماری نسل کشی سے ہے اور اس کے لئے سازش تیار کر لی گئی ہے جس کی نشاندہی حالیہ سرکیولر سے ہوتی ہے۔

ہمارے نمائندوں نے باثوق ذرائع کے حوالے سے بتایا ہے کہ صدر محترم کی اس تقریر کی تائید تمام معزز حاضرین نے کی۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

کب تک

☆

پُرانے زمانے میں آگ لگانے کے لئے خاص قسم کے دو پتھر آپس میں ٹکرائے جاتے تھے۔ پھر وقت بدل گیا۔ زمانے نے بہت ترقی کرلی۔ انسان تیر کمان اور غلیل کی منزلیں طے کرتا ہوا بندوق بردار طاقت بن گیا اور آگ لگانے کیلئے ''ماچس'' کی ایجاد ہوئی۔ پھر زمانے نے ترقی کی رفتار میں مزید تیزی دکھائی۔ انسان ایٹم بردار طاقت بن گیا۔ اُس نے سمندروں کو گزرگاہ بنالی۔ وہ خلاؤں میں محو پرواز ہو گیا اور آگ لگانے کے لئے ''سیفٹی ماچس'' ایجاد کی گئی۔ مگر ہمارا ملک ترقی کی اس دوڑ میں کچھ زیادہ ہی آگے نکل آیا اور اس زبردست ترقی کا سہرا قومی پریس کے سر باندھنا چاہیئے جس نے کشمیر میں آگ لگانے کے لئے جھوٹے پروپگنڈے کی ایجاد کی۔

ہمارے پیارے کشمیر میں معمولی سی گڑبڑ بھی ہو جائے تو ہر گڑبڑ پر پولیس ''چوب ایٹ سائیٹ'' کا عمل شروع کر دیتی ہے اور میرے پولیس برادران بے گناہوں کے سروں پر ڈنڈوں کی ''مہریں'' چسپاں کر کے اپنی تنخواہوں کو ''حلال'' کرتے ہیں۔ مگر ہمارا قومی پریس کوئی چیخ بلند نہیں کرتا۔ آج تک ہر کسی کے دور حکومت میں یہاں گولیوں کی برسات ہوئی اور نوجوانوں کی فصل کٹتی رہی۔ قومی پریس نے چرچا نہیں کیا۔ شہر کی ایسی کون سی سڑک ہے جو کشمیری عوام کے لہو سے گیلی نہیں ہوئی۔ کیا قومی پریس کو یہ بات معلوم ہے۔؟۔ کیا ہمارا نام نہاد قومی پریس اس سوال کا جواب

دے سکتا ہے کہ آج تک یہاں اقلیتی فرقے کا کون نوجوان پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنا؟۔آج تک اقلیتی فرقے کی کس دوشیزہ کی آبرو لوٹی گئی۔کیا وہ مُسلمان نہیں تھا جس نے ہمیشہ یہاں کے ہندو کو پناہ دی اور اُس کی حفاظت کی؟۔کیا ہمارا نام نہاد قومی پریس تواریخ کا مطالعہ بھی نہیں کرتا۔!؟

کشمیر کا اکثریتی فرقہ المیے کا شکار ہے۔وہ اپنے حقوق کے لئے آواز بلند نہیں کرتا تو اُسے بے غیرت کہا جاتا ہے۔وہ جائز حقوق کے لئے جدوجہد شروع کرتا ہے تو تخریب کار گردانا جاتا ہے۔قومی پریس والو!۔آخر آپ کشمیری عوام سے کیا چاہتے ہیں؟

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

نثار تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

☆

صحافت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو اخبار نویسی کہتے ہیں اور دوسری اخبار فروشی مانی جاتی ہے۔ اخبار نویسی اور اخبار فروشی دو الگ الگ پیشے ہیں اور ہر پیشے کے پیچھے الگ الگ عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اخبار فروشی اور اخبار نویسی کے دو الگ الگ دروازے بھی ہیں۔ اخبار فروشی کے دروازے پر آرام و آسائش، شان و شوکت، دولت و جائیداد کے ان گنت ہاتھ دستک دیتے رہتے ہیں اس لئے بیشتر صحافی زیادہ تر اسی دروازے پر اپنا ڈیرہ جما لیتے ہیں۔ انسان فطری طور بڑا لالچی واقع ہوا ہے اس لئے فطرت سے مجبور ہو کر عام صحافی اسی دروازے کو اپنا منزل مقصود مان لیتا ہے اور دولت کی دیوی اُس پر مہربان ہوتی ہے، اثر و رسوخ اُس کی لونڈی بن جاتی ہے۔

اب رہا اخبار نویسی کا دوسرا دروازہ! اس کو پولیس کے ڈنڈے، سرمایہ داروں کے زرخرید غنڈوں کی آہنی سلاخیں اور سرکاری عتاب کی لاٹھیاں کھٹکھٹاتی ہیں۔ بھلا آپ ہی بتائیے کہ اس دروازے پر کون سینہ سپر ہوگا؟۔۔۔۔۔ مگر:

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

آپ بھی اپنا خیال رکھئے گا!

لمحوں نے خطا کی ہے
برسوں نے سزا پائی

☆

فلاں لیڈر کی بیٹی میٹرک کے امتحانات میں امتیازی نمبرات حاصل کر کے پاس ہوگئی۔ مبارک ہو۔۔۔! فلاں تاجر کی دختر نے امتیازی نمبرات حاصل کر کے اول درجہ پا لیا۔ مبارک ہو۔۔۔! غریب لوگوں کا خون چوسنے والے کئی بیروکریٹوں کی پُتر یاں اور پُتر فسٹ ڈویژن لائے۔ مبارک ہو۔! سُنا ہے کانوینٹ اور دوسرے مہنگے سکولوں میں پڑھتے تھے یہ بچے۔ عام لوگ ایسے سکولوں کے پرنسپل تک تو درکنار گیٹ تک بھی نہیں پہونچ سکتے اور نہ ہی ان غریب والدین میں وہ طاقت ہے کہ اپنے بچوں کے لے ایسے سکولوں کی فیس کو برداشت کرسکیں۔ غریب بچوں نے سرکاری سکولوں میں پڑھا اور دونوں (یعنی سکول اور بچہ) اس حد تک ایک دوسرے کے پیار میں گرفتار ہوئے کہ سکول اِن بچوں کو اپنے سے جدا کرنے پر تیار نہیں۔ یہ کوئی باغی ہی ہوتا ہے جو میٹرک میں پاس ہونے کے بعد سکول کو داغ مفارقت دے کر چلا جاتا ہے۔ کئی سکولوں میں لڑکے دس سال سے برابر صرف دسویں جماعت میں بیٹھے ہیں۔ بھلا سرکاری سکول کے بچوں کو قوم کا مستقبل کون مانتا ہے! یہاں کے عوام کا پورا مستقبل لیڈروں کی اولادوں سے وابستہ رہتا ہے۔ لیڈروں کی اولادیں لیڈر بنتے ہیں اور کلرک یا غریب دکاندار کا بیٹا صرف ووٹر بنتا ہے۔ ویسے اب جمہوریت کے اس دور

میں دونوں کی ضرورت بھی زیادہ اہم خیال نہیں کی جاتی کیونکہ اب ایسے سائنسی آلات ایجاد ہوئے ہیں جو خود ووٹ بناتے ہیں اور خود بکسوں میں ڈال کر خود ہی امیدوار کی کامیابی کا اعلان کرتے ہیں۔

سُنا تھا یہاں الیکشن میں ووٹ چوری ہوتی ہے چونکہ یہ چوری اب کشمیر کی بے ضابطہ روایت بن چکی ہے اس لئے ایسی چوریوں کا انکشاف یہاں کوئی سنسنی پیدا نہیں کرتا۔ مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ اب بورڈ حکام نے بھی یہاں کے لیڈروں کے نقش قدم پر چلنے کا آغاز کیا ہے۔ میٹرک کے پرچوں کے متعلق جو ہیرا پھیری اور دھاندلیوں کے واقعات منظر عام پر آگئے، سُنا ہے اس پر لیڈر لوگ بورڈ حکام کی زبردست پذیرائی کر رہے ہیں اور آئندہ الیکشن میں بورڈ کے ان اہلکاروں کو ووٹنگ کا انچارج بنانے کی تجویز بھی حکومت کے زیر غور ہے۔

بہر حال، اپنا خیال رکھئے گا!

شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات

میرے دماغ کی مچھلیاں کئی دنوں سے سوچ کے سمندر میں یہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ وادی میں لوگ جن چیزوں کی قلتوں کا رونا رو رہے ہیں کیا اس کے پیچھے کوئی صداقت ہے یا محض رونے کا روایتی جشن منانے کا بہانہ ہے؟ آخر کار میرے دماغ کے چوہے اس سوال کا جال کترنے میں کامیاب ہو ہی گئے اور میں اس نتیجے پر پہونچا کہ اپنے یہاں کسی چیز کی کوئی بھی کمی نہیں ہے بلکہ ہر چیز کی فراوانی ہے۔ جب ان باتوں کا اظہار اپنے ایک دوست کے سامنے کیا تو وہ تلملا اُٹھا اور مجھ سے کہا: ''جہانگیر! تیرے دماغ کی گلاریاں سوچتے سوچتے گھس گئی ہیں''۔ میں نے پوچھا ''اور تیرا دماغ؟'' وہ بولا: ''میرے دماغ میں ۷ اجیول لگے ہیں اور گلاریاں درست حالت میں ہیں'' ساتھ ہی گویا ہوا'' تم چیزوں کی کمی کی بات کرتے ہو میں پوچھتا ہوں ہمارے یہاں ہے ہی کیا؟''۔ اب مجھے بھی غصہ آیا۔ ویسے اپنے یہاں کسی کو غصہ نہیں آتا۔ کبھی کبھار بھی نہیں آتا۔ بسوں میں اتنی اوورلوڈنگ کی جاتی ہے کہ مسافروں کا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے کیا کسی کو غصہ آتا ہے؟ دس روپے والی چیز کے لئے دکاندار بیس روپے مانگے، کیا کسی کو غصہ آتا ہے؟ آٹو رکشا والے کو شام کے وقت لالچوک سے حول جانے کے لیے کہا جائے، وہ صاف انکار کر دیتا ہے کیا کسی کو غصہ آتا

ہے؟ ہوٹلوں میں گاہکوں کو ٹوٹی پھوٹی کراکری میں کھانے کی چیزیں دی جاتی ہیں، کیا کسی کو غصہ آتا ہے۔؟ منی بس والے ریز گاری نہ ہونے کا بہانہ بنا کر پورا روپیہ ہڑپ کر لیتے ہیں، کیا کسی کو غصہ آتا ہے؟ اسی لیے جب مجھے اپنے دوست کی بات پر غصہ آیا تو میں بہت حیران ہوا کہ یاالٰہی! مجھے اور غصہ؟۔ بہر حال میں نے اپنے دوست سے پوچھا: "بھلا مجھے یہ تو بتاؤ کہ یہاں تمہیں کس چیز کی کمی دکھائی دے رہی ہے!" تو وہ پھوٹ پڑا "ہمارے علاقے میں پانی نہیں ہے"۔ میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے کی الماری سے ایک اخبار نکال کر دوست کے سامنے پھینکا اور ایک اعلیٰ سیاسی لیڈر کا تازہ بیان پڑھنے کو کہا۔ میرے دوست نے جب لیڈر کا یہ بیان پڑھا تو پانی پانی ہو گیا۔ اس پر میں نے اپنے دوست کو مشورہ دیا کہ جہاں جہاں تمہیں پانی کی کمی نظر آجائے، لوگوں کو یہ بیان پڑھنے کو دے دو وہ اتنے پانی پانی ہو جائیں گے کہ پانی کی کمی دور ہو گی۔ دوست میرے جواب سے قائل ہوا تو کہا کہ "بجلی کی کمی نہیں ہے کیا؟"۔ "نہیں" میں نے جواب دیا "ارباب اقتدار یہاں کے عوام پر روز روز بجلیاں گراتے رہتے ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟ یہاں کے بیروکریٹ سائیلوں پر بجلیاں برساتے رہتے ہیں، کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟ انصاف کے لئے آواز بلند کرو تو حکمرانوں کی بجلی کڑکتی ہے۔ کیا تمہیں کبھی واسطہ نہیں پڑتا؟ جہاں دیکھو بجلی ہی بجلی ہے"۔

اس وادی میں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو وہ شرم کی کمی ہے۔ بجلی والوں کو دیکھو۔ بڑی بے شرمی سے بجلی کی کٹوتی کا اعلان کرتے ہیں اور بڑی بے شرمی سے صارفین کو نئے ایگریمنٹ کرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ قصاب کی دکان پر ۲۶ روپے گوشت کلو کا

نرخنامہ آویزاں ہے مگر بڑی بے شرمی سے ۳۶ روپے کلو پر گوشت فروخت کرتا ہے۔
نانبائی بڑی بے شرمی سے روٹیوں کے وزن میں کمی کر دیتا ہے۔ صارفین کو بڑی بے
شرمی سے مضر صحت آٹا سپلائی کیا جاتا ہے۔۔۔ ڈیپوؤں پر بڑی بے شرمی سے غیر
معیاری چاول فراہم کیا جاتا ہے۔ سرکاری دفاتر میں دن کے اُجالے میں بڑی بے
شرمی سے رشوت طلب کی جاتی ہے۔ دُلہا بڑی بے شرمی سے جہیز کا تقاضا کرتا ہے۔
غرض اپنے شہر میں شرم کی بڑی کمی ہے!

بہر حال، اپنا خیال رکھیے گا!

〈۵۲〉

محفل مشاعرہ

حال ہی میں سرینگر میں ایک محفل مشاعرے کا انعقاد ہوا چونکہ اس میں کئی نامور سیاسی لیڈروں نے شرکت کی اس لیے مشاعرے کی کارروائی کو خفیہ رکھا گیا۔ مجھے بھی اس بزم میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں مشاعرے کی کاروائی کے چند اقتباسات پیش کرر ہا ہوں۔

سب سے پہلے متحدہ محاذ کے لیڈر قاضی نثار صاحب سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کریں۔ چنانچہ قاضی نثار صاحب مائیک پر تشریف لائے اور عوامی نیشنل کانفرنس کے سربراہ غلام محمد شاہ کی طرف اشارہ کر کے یوں گویا ہوئے۔

"بُجھ گیا تمہاری شان کا حُقّہ
یہ ہم ہی ہیں کہ گُڑگُڑائے جاتے ہیں"

اس کے بعد غلام رسول کار صاحب نے اپنا کلام سُنایا اور میر لسجن صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"لوگ تیری وزارت کو سیاہ رات کہتے ہیں
تو اگر کُرسی سے اُتر جائے تو اُجالا ہو جائے"

اس کے بعد مولانا فاروق صاحب مائیک پر تشریف لائے اور یہ شعر سُنایا۔

''سارے جہاں سے اچھا راز ے کدل ہمارا

پولنگ میں اب رہے گا بٹوہ نشان ہمارا''

پھر مفتی سید صاحب کھڑے ہوئے اور کار صاحب کی طرف اشارہ کر کے بولے:

''بنے ہیں ''شاہ'' کے مصائب اور پھرے ہیں اتراتے

وگرنہ شہر میں کانگریس کی حیثیت کیا ہے؟''

اس پر کار صاحب نے برجستہ جواب دیا

''ہم نہ ڈوبیں گے صنم

پرتم کو لے ڈوبیں گے ہم''

آخر میں میری باری آئی اور میرے اس شعر پر مشاعرہ برخاست ہوا۔

''چمن کے رنگ و بو نے اس قدر دھوکے دیئے ہم کو

کہ ہم نے شوق گلبوسی میں کانٹوں پر زبان رکھ دی''

بہر حال، اپنا خیال رکھیئے گا!

بُری نظر سے دیکھنے والے تیرا مُنہ کالا

☆

چند دن پہلے کی بات ہے میں نے لال چوک سے ایک ٹرک گزرتے دیکھا۔ یوں تو سڑک پر کسی ٹرک کا دیکھنا کوئی حیرت انگیز یا انہونی بات نہیں ہے۔ میں نے شہر کی تنگ گلیوں اور کوچوں میں بھی ٹرکوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا ہے پھر بھی کبھی حیرت نہیں ہوئی۔ دیکھا جائے تو لوگوں کا ٹرکوں کے نیچے آکر ہلاک ہونے پر بھی اب کوئی حیرت نہیں ہوتی کیونکہ جو بات روز کا معمول بن جائے پھر بھلا اُس میں حیرت کا عنصر باقی کہاں رہتا ہے۔!

بہرحال، میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں نے ایک ٹرک دیکھا۔ اس ٹرک کے پیچھے لکھا گیا تھا ''بُری نظر سے دیکھنے والے تیرا مُنہ کالا''۔ ٹرک پر ایسا ریمارک دیکھ کر بھی مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب مجھے کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ مجھے اُس روز بھی کوئی حیرت نہیں ہوئی جب الیکشن کے زمانے میں ہمارے علاقے کے ایک پولنگ بُوتھ پر ایک اُمیدوار کے حق میں ایک سو بیس ووٹ پڑے اور اُس کے حریف اُمیدوار کے حق میں صرف ۵ ووٹ ڈالے گئے لیکن جب ووٹنگ کی گنتی کی گئی تو حریف امیدوار کے حصے میں ایکسو بیس ووٹ گنے گئے اور ایک سو بیس ووٹ والے اُمیدوار کے حق میں بیلٹ بکس سے صرف ۵ ووٹ برآمد ہوئے۔

میں ٹرک پر "بُری نظر سے دیکھنے والے تیرا مُنہ کالا" لکھے گئے ریمارک کی بات کر رہا تھا۔ کیونکہ یہ جملہ پڑھ کر مجھے بہت ہنسی آئی اور لکھنے یا لکھوانے والے کی بے عقلی پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔ اُس بے چارے کو یہ معلوم نہیں کہ یہاں بُری نظر سے دیکھنے والے کا کبھی مُنہ کالا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو لیڈروں کے چہرے اُجلے کیوں ہوتے؟ سرمایہ داروں کے چہرے شفاف کیسے ہوتے؟

بیوروکریٹوں کا چہرہ کبھی کالا نہیں ہوتا۔ اپنے یہاں تو کوئلے کی دلالی میں بھی مُنہ صاف ستھرا رہتا ہے۔ ہاں اس شہر کے بہت سے لوگوں کے دل کالے ضرور ہیں اور اس کالے پن کا عکس چہرے پر نہیں آنکھوں میں نمایاں رہتا ہے۔

بہر حال، اپنا خیال رکھیۓ گا!

انتساب:

حق تو یہ ہے کہ میں آج تک اس روئے زمین پر کسی ایسے فرد کو دریافت نہ کر سکا جو مجھ ذرۂ بے مقدار سے پیار کرتا ہو۔اسی احساس میں بچپن گزرا اور اسی خیال میں جوانی ڈھل گئی۔سفید داڑھی نے چہرے کا احاطہ کیا اور وقت کے تھپیڑوں نے خدوخال کا جغرافیہ بدل دیا لیکن پیار کی وہ ہسٹری تبدیل نہ ہوسکی جو بے مروتیوں اور بے وفائیوں سے ترتیب پائی ہے۔

مجھے جو لوگ مل گئے ان کے لئے محبت تفریح تھی، دوستی بیوپار تھا اور رشتے زبردستی تھی۔اس نا کارۂ خلائق نے 'لین دین' کے محور پر ہی اس دنیا کو گھومتے دیکھا ہے۔

محبت کو اپنے منصب سے ہٹایا گیا ہے چنانچہ خودغرضی نے انسانیت دبوچ لی ہے۔

اس کتاب کا انتساب ایسے شخص کے نام ہے جو واقعی محبت کے مفہوم سے واقف ہو!

نذیر جہانگیر

میرے کچھ دوستوں کے نام!

میرے جذبات مجھے اپنے اُن پسندیدہ دوستوں کے تذکرے پر مجبور کر رہے ہیں جن کی صحبت میں یا ملاقات سے غموں کی شدت دھیمی پڑ جاتی ہے۔ان میں کئی ایک کے سامنے میرا کچا چٹھا ظاہر بھی ہے مگر اس کے باوجود مجھے ہمیشہ اُن سے شفقت ہی ملی ہے۔

میرے دُعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ اُنہیں اپنے سایہ عافیت میں رکھے۔ میرے ان کرم فرماؤں کے اسمائے گرامی ہیں:

۱ بشیر ملک صاحب (جو بشیر اطہر کے نام سے بھی معروف ہیں) پُر کشش شخصیت کے مالک اور خوبصورت قلم کار ہیں۔ تقریباً تیس سال سے ان کی رفاقت حاصل رہی ہے۔اُن کی طبیعت میں فیاضی بہت ہے۔

۲ غلام نبی سرشار صاحب۔یہ ایک شریف النفس آدمی ہیں۔اپنے قلم پر اعتماد نے ہی اسے روزنامہ آفتاب میں کچھ مدت تک کام کرنے پر آمادہ کیا تھا اور یہی وسیلہ ہماری دوستی کا سبب بھی بنا۔ان کی شکل وصورت ہی نہیں بلکہ مزاج بھی درویشانہ ہے۔ ان سے بھی میری دوستی کی عمر تیس سال پر محیط ہے۔

۳ مجید عاصمی صاحب۔ان میں اور مجھ میں معمولی فرق کے ساتھ کچھ باتیں قدرے مشترک ہیں۔یہ ہر کسی کو پیار دیتے ہیں اور میں ہر کسی میں پیار ڈھونڈتا ہوں۔ یہ (تقریباً) ہر کسی کو چائے پلاتے ہیں اور میں (تقریباً) ہر کسی کی چائے پیتا ہوں۔یہ سیمابی کیفیت کے انسان ہیں، میں آوارہ قسم کا آدمی ہوں۔ان کے دوستوں کی فہرست

بڑی طویل ہے اور میری ایسی فہرست میں میں ہی سرفہرست ہوں۔ مجموعی طور اچھے

انسان ہیں۔

۴ شفیع شوق صاحب۔

بہت شوق سے سُن رہا تھا زمانہ

ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

۵ نثار احمد بالا صاحب۔ ریڈیو کشمیر میں لائبریرین ہیں۔ یہ میرے ہی نہیں ہر کسی کے کام آتے ہیں۔ جس سے ملتے ہیں تپاک سے ملتے ہیں۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ یوں مسکراہٹ چھائی رہتی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مسکرا چکے ہیں یا مسکرانے والے ہیں۔!

OTHER PUBLICATIONS OF THE AUTHOR

(1) **Life, Hadith and Mysticism**.............................*English*

(2) **Knotty Mysteries**...*English*

(3) **Dreams**..*English*

(4) **LALDED,** ***a great mystic poetess*** **[under print]**....*English*

(5) **Behtay Jism**..*Urdu*

(6) **Mo'aashray Main Bura'ion Kay Asbab**................*Urdu*

(7) **Bilaktay Qehqehay**..*Urdu*

(8) **Asrar**..*Kashmiri*

(9) **Pho'hun Te Dug** ....*Kashmiri*

(10) **Jahangir Katha**...*Kashmiri*

(11) **Chok'a'lad Woush**...*Kashmiri*

(12) **Ra's'i Weath**..*Kashmiri*